

اوور کوٹ

محکمہ... لیکن میرے خیال میں بہتر یہ ہوگا کہ ہم یہ نہ کہیں کہ ٹھیک ٹھیک کس محکمے میں - اس لئے کہ یہ سارے محکمے، رجمنٹیں، چانسلیریاں - مختصر یہ کہ سرکاری ملازمت کی ساری امارتیں بہت ہی بددماغ ہیں - آج کل عام شہریوں کی اگر ذاتی طور پر کوئی توہین کی جاتی ہے تو وہ اسے پورے سماج کی توہین سمجھ لیتے ہیں - کہتے ہیں کہ ابھی حال ہی میں کسی شہر کے پولیس سپرنٹنڈنٹ کی جانب سے ایک شکایت موصول ہوئی ہے جس میں اس نے بالکل صاف صاف کہا ہے کہ سارے ریاستی ادارے برباد ہو رہے ہیں اور اس کا اپنا مقدس نام بھی یقیناً بیجا طور پر لیا جا رہا ہے - ثبوت کے طور پر اس نے اپنی عرضی کے ساتھ ایک ضخیم جلد انتھی کر دی ہے جو بعض روسانوی تحریروں پر مشتمل ہے - اس میں ہر دسویں صفحے پر ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ کا ذکر ہے کبھی کبھی مکمل مدہوشی کی حالت میں - چنانچہ اس طرح کی کسی ناخوشگوار صورت سے بچنے کے لئے اچھا یہی ہے کہ ہم اس محکمے کو جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں "ایک کوئی محکمہ" کہیں -

چنانچہ ایک کسی محکمے میں ایک کوئی عہدیدار کام کرتے تھے - اس عہدیدار کو کوئی بہت قابل ذکر شخصیت نہیں کہا جا سکتا - وہ پستہ قد، قدرے چیچک رو تھے، بال قدرے لال سے، بینائی بہ ظاہر بالکل صحیح سے قدرے کم، قدرے گنج کی طرف مائل بال، گالوں کے دونوں طرف جھریاں اور رنگت ایسی

جسے بواسیری کہا جا سکتا ہے... خیر اب اس کا کیا کیا جائے؟
یہ تو پیٹرس برگ کی آب و ہوا کا قصور ہے۔ جہاں تک ان کے
عہدے کا سوال ہے (اور ہمارے ہاں سب سے پہلے عہدے کا
اعلان کرنا ہوتا ہے) وہ اس نوع سے تعلق رکھتے تھے جنہیں
ابدی خطابی کونسلر کہا جاتا ہے جو جیسا کہ قارئین جانتے
ہیں بہت سے ان ادیبوں کی پھبتیوں اور مذاق کے ہدف ہیں جن
کی قابل تعریف عادت ہوتی ہے ان لوگوں پر چوٹیں کرنا جو
الٹ کر چوٹ نہیں کر سکتے۔ ان سرکاری عہدیدار کا خاندانی
نام تھا بشماچکین۔ اس سے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ نام لفظ
”بشماک“ سے نکلا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں جوتا۔ لیکن
کب، کس وقت اور کس طریقے سے جوتے سے یہ مشتق بنایا گیا
ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ان کے والد اور دادا دونوں بلکہ یہاں
تک کہ ان کے بہنوئی اور سارے ہی بشماچکین گھٹنوں تک کے
جوتے پہنے گھومتے تھے جنہیں وہ کبھی نہیں بدلتے تھے، بس سال
میں تین بار ان میں نئے تلوے لگوا لیتے تھے۔ ان کا اپنا نام اور
ولدیت اکاکی اکاکیٹیوچ تھی۔ ہو سکتا ہے قاری کو یہ ذرا
عجیب اور مصنوعی سا لگے لیکن میں اسے یقین دلا سکتا ہوں کہ
اس کے انتخاب میں تصنع کو کوئی دخل نہیں تھا بلکہ ان کا
نام رکھنے کے حالات ہی ایسے تھے کہ کوئی اور نام ممکن نہیں
تھا۔ یہ سب اس طرح ہوا۔ اگر میرا حافظہ مجھے دھوکا نہیں
دے رہا ہے تو اکاکی اکاکیٹیوچ ۲۳ مارچ کی رات کو پیدا ہوئے
تھے۔ ان کی مرحومہ ماں خود بھی ایک افسر کی بیوی اور بہت ہی
عمدہ عورت تھیں۔ انہوں نے مناسب اور صحیح طریقے سے بیٹے
کا نام رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ماں ابھی دزواڑے کے سامنے اپنے
پلنگ ہی پر لیٹی تھیں اور ان کے بائیں ہاتھ کو دینی باپ، بہت ہی
اچھے مرد شریف ایوان ایوانوویچ یروشکین تھے جو سینیٹ میں ہیڈ
کلرک تھے، اور دینی ماں بھی موجود تھیں جو ایک پولیس افسر
کی بیوی اور بہت ہی نایاب خوبیوں کی عورت تھیں، ارینا سیمیونوونا
بیلاہریوشکووا۔ نئی ماں کو تین ناموں میں سے انتخاب کرنے کو
کہا گیا: سوککی، سوسی یا شہید خوزدازت کے نام پر۔ ان مرحومہ
نے سوچا ”نہیں، یہ ٹھیک قسم کے نام نہیں ہیں“۔ انہیں خوش

کرنے کے لئے جنتری کو ایک اور صفحے پر کھولا گیا اور ایک بار پھر تین نام تجویز کئے گئے: تریفیلی، دولا اور وراخاسی۔ بڑی ہی نے اعلان کیا ”کیا مصیبت ہے! سب اتنے برس تک نام کہ میں تو سمجھتی ہوں کہ کبھی میں نے سنے ہی نہیں۔ وراثت بلکہ یہاں تک کہ واروخ بھی غنیمت ہوتا لیکن تریفیلی اور وراخاسی تو ہرگز نہیں۔“۔ لوگوں نے جنتری کا ایک اور صفحہ کھولا اور انہیں دو نام ملے پاوسی کاخی اور وختیسی۔ بڑی ہی نے قطعی طور پر کہا ”نہیں، اب مجھے بالکل یقین ہو گیا کہ یہ سب قسمت کا کھیل ہے۔ اچھا یہ ہوگا کہ اس کو اس کے باپ ہی کا نام دیا جائے۔ اس کا باپ اکاکی تھا تو بیٹا بھی اکاکی ہی ہو۔“۔ تو یوں ان کا نام ہو گیا اکاکی اکاکیٹیوچ۔ مناسب طریقے سے بچے کا نام رکھنے کی رسم ادا کی گئی اور اس کے بیچ ہی میں اس نے رونا شروع کر دیا اور ایسے ایسے منہ بنانے لگا جیسے وہ پہلے ہی سے جان گیا ہو کہ ایک دن وہ خطابی کونسلر بنے گا۔

تو اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ ہم نے موضوع سے یہ انحراف اس لئے کیا کہ قاری خود دیکھ لے کہ یہ عین ضرورت کا معاملہ تھا اور انہیں کوئی دوسرا نام دینا ممکن ہی نہ تھا۔ وہ کب اور کس عمر میں اور کس کی سفارش پر اس محکمے میں ملازم ہوئے یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ جانے کتنے ڈائریکٹر آئے اور چلے گئے، ایک کے بعد دوسرے سپرنٹنڈنٹ ہوتے رہے لیکن وہ اپنی جگہ ہی پر رہے، اسی عہدے پر، اسی کام پر، ایک معمولی نقل نویس۔ چنانچہ بعد کو لوگ قسم کھاتے تھے کہ وہ اس دنیا میں بالکل اسی حالت میں، وردی اور گنج سمیت پیدا ہوئے ہوں گے۔ محکمے میں ان کی ذرا بھی عزت نہ کی جاتی تھی۔ جب وہ گزرتے تو نہ صرف یہ کہ دربان کھڑے نہ ہوتے بلکہ ان کی طرف دیکھتے تک نہ تھے، جیسے وہ ہال میں اڑتی ہوئی کوئی مکھی ہوں۔ ان کے افسران اعلیٰ ان کے ساتھ سرد مہری کے ساتھ حاکمانہ انداز میں پیش آتے تھے۔ کوئی نائب ہیڈ کلرک ان کی ناک کے نیچے کاغذ ٹھونس دیتا اور یہ کہنے تک کی زحمت نہ کرتا کہ ”ذرا اس کو نقل کر دیجئے،“ یا ”لیجئے یہ چھوٹا سا

دلچسپ کام ہے،، یا کوئی ایسی ہی دوستانہ بات جو زیادہ مہذب اداروں میں عام طور سے کہی جاتی ہے۔ وہ ان کاغذات کو لے لیتے اور صرف انہیں کو دیکھتے، نہ تو یہ دیکھتے کہ کس نے دیا ہے نہ یہ کہ اسے دینے کا حق بھی ہے یا نہیں۔ وہ لے لیتے اور فوراً نقل کرنے میں لگ جاتے۔ نوجوان عہدیدار جہاں تک ان کی کلرکی والی طباعی کام کرتی، ان کا مذاق اڑاتے اور ان پر پھبتیاں کستے، ان کی موجودگی ہی میں ان کے بارے میں قسم قسم کے من گھڑت قصے سناتے، ان کی مکان مالکن کے بارے میں جو ستر سے اوپر کی تھیں، کہتے کہ وہ ان کو پیٹتی ہیں، پوچھتے کہ مالکن کے ساتھ ان کی شادی کب ہوگی اور کاغذ پھاڑ کر ان کے سر کے اوپر کنفیتی کی طرح چھڑک دیتے۔ اکاکی اکاکیٹیوچ اس سب کے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہتے، یوں بن جاتے جیسے ان کے سامنے کوئی ہو ہی نہیں۔ اس سے ان کے کام پر بھی کوئی اثر نہ پڑتا۔ ان سب چہلوں کے درمیان بھی ان سے اپنی نقل نویسی میں ایک بھی غلطی نہ ہوتی۔ بس جب مذاق حد سے بڑھ جاتا اور ان کے بازو پر ٹھوکے لگائے جاتے اور انہیں کام نہ کرنے دیا جاتا تب وہ احتجاج کرتے ”مجھے تم لوگ میرے حال پر کیوں نہیں رہنے دیتے، آخر کیوں مجھے ستاتے ہو؟“، اور ان لفظوں میں کوئی عجیب بات ہوتی اور اس لہجے میں بھی جس میں یہ کہے جاتے۔ ان میں کوئی چیز دردناک سی ہوتی جس کی وجہ سے ایک نوجوان، جس کا ابھی ابھی تقرر ہوا تھا اور جو ان کا مذاق اڑانے میں دوسروں کے نقش قدم پر چل رہا تھا، اچانک ٹھٹھک کر رہ گیا اور اس کے بعد سے ہر چیز کو وہ بالکل ہی دوسری روشنی میں دیکھنے لگا۔ کسی غیر قدرتی قوت نے اسے اپنے نئے دوستوں سے الگ کر دیا جنہیں وہ شائستہ، تمیزدار لوگ سمجھا تھا۔ اور اس کے بہت دنوں بعد تک، بڑی ہنسی خوشی کے موقعوں پر اسے یہ بڑھتی ہوئی گنج والا جھکا ہوا کلرک اور اس کے چہہ جانے والے الفاظ یاد آتے رہے: ”مجھے تم لوگ میرے حال پر کیوں نہیں رہنے دیتے، آخر کیوں مجھے ستاتے ہو؟“، اور ان لفظوں میں اسے اور ہی الفاظ کی گونج سنائی دیتی ”میں تمہارا بھائی ہوں،“۔ ایسے لمحوں میں یہ بیچارہ نوجوان اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں

سے ڈھانپ لیتا۔ اپنی زندگی میں متعدد بار انسان کو انسان کے ساتھ بیرحمی سے پیش آتے دیکھ کر، ایک سہذب، تعلیم یافتہ اور شائستہ پرت کے نیچے چھپے ہوئے کمینہ بھونڈے پن پر وہ کانپ کانپ اٹھا۔ یا خدا! ان لوگوں میں بھی جنہیں دنیا شریف اور دیانتدار تسلیم کرتی ہے۔

بہ مشکل ہی آپ کو کوئی دوسرا شخص ایسا ملتا جو اپنے فرائض اتنی پابندی و تندہی سے ادا کرتا ہو۔ یہی بات نہ تھی کہ وہ محنت سے کام کرتے تھے بلکہ وہ محبت سے کام کرتے تھے۔ اپنے کام میں، اپنی نقل نویسی میں وہ ایک ایسی دنیا دیکھتے جو رنگا رنگ اور دلکش تھی۔ ان کے چہرے پر خوشی کا تاثر پیدا ہو جاتا۔ حروف تہجی کے بعض حرف انہیں خاص طور سے پسند تھے اور انہیں دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ وہ مسکراتے، آنکھ مارتے اور منہ سے ایسی آوازیں نکالتے کہ ان کے قلم سے نکلے ہوئے حرف کو ان کے چہرے پر پڑھنا ممکن ہوتا۔ اگر ان کو اپنے جوش کا مناسب صلہ ملا ہوتا تو وہ اسٹیٹ کونسلر ہو گئے ہوتے حالانکہ اس پر وہ خود بھی حیران رہ جاتے۔ لیکن جیسا کہ ان کے طباع ساتھی کہا کرتے تھے ان کا سارا انعام تھا سامنے ایک بلا اور پیچھے بواسیر۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ ایک ڈائریکٹر طبیعتاً نیک آدمی تھے۔ وہ انہیں ملازمت کی طویل مدت کے صلے میں انعام دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ انہیں نقل نویسی سے زیادہ اہم کام دیا جائے جو یہ تھا کہ انہیں دوسرے دفتر کے ایک مکمل شدہ کیس کی رپورٹ لکھنے کا حکم دیا گیا۔ اس میں کرنا صرف یہ تھا کہ سرخی بدل دی جائے اور یہاں وہاں افعال کو صیغہ متکلم سے بدل کر صیغہ غائب میں کر دیا جائے۔ ان کے لئے یہ اتنا مشکل کام تھا کہ انہیں پسینے آ گئے، انہوں نے اپنی پیشانی پونچھی اور بالآخر کہا ”نہیں، مجھے تو کچھ نقل ہی کرنے کو دیجئے!، اس کے بعد سے وہ ہمیشہ نقل نویس ہی رہے۔ اس نقل نویسی کے علاوہ ان کے لئے بہ ظاہر اور کوئی دنیا وجود نہ رکھتی تھی۔ وہ اپنے لباس کی طرف کبھی دھیان ہی نہ دیتے تھے۔ ان کی وردی اب سبز نہیں رہ گئی تھی بلکہ دھبے دار

کھیری ہو گئی تھی۔ اس کا کالر نیچا اور تنگ تھا جس کی وجہ سے ان کی گردن، جو اوسط لمبائی کی تھی، باہر نکلی رہتی اور بہت ہی لمبی لگتی، ان پلاسٹر آف پیرس کے بنے ہوئے بلوں کی طرح کی جن کی گردنیں ہلتی رہتی ہیں اور جنہیں بیرونی خوانچہ والے سروں پر ٹوکریوں میں لئے پھرتے ہیں۔ اور ان کی وردی پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ چپکا رہتا، کوئی تنکا یا کوئی دھاگا۔ پھر انہیں اس بات میں خاص مہارت حاصل تھی کہ سڑک پر چلتے چلتے ایسے وقت ضرور کسی کھڑکی کے نیچے پہنچ جائیں جب اس میں سے گندہ پانی یا کوڑا پھینکا جا رہا ہو۔ چنانچہ ان کی ہیٹ پر تربوز کے چھلکے یا کچھ اور کوڑا ضرور ہوتا۔ زندگی میں کبھی ایک بار بھی انہوں نے روزمرہ کے واقعات اور سڑک پر کے حال چال کی طرف کوئی توجہ نہ کی تھی جسے ان کے نوجوان ہمارے اتنے غور سے دیکھتے تھے اور جنہوں نے چوکنی نظر کی تیزی کو اس قدر بڑھا لیا ہے کہ وہ سڑک کی دوسری طرف بھی دیکھ لیتے ہیں کہ کس رکاب کا تسمہ ڈھیلا رہ گیا۔ اس فروگزاشت پر ان کے چہروں پر ضرور حقارت آمیز مسکراہٹ پیدا ہو جاتی۔

لیکن اکاکی اکاکیٹھ اپنے ارد گرد کی چیزوں میں سے اگر کسی چیز کو دیکھتے بھی تو وہ تھیں ان کے ستھرے ہاتھوں پر اپنی ہوئی ہموار لکیریں۔ اور جب کوئی گزرتا ہوا گھوڑا ان کے کندھے کے اوپر اپنے نتھنے نکال کر زور سے گھوڑوں کی سانس میں پھپکارتا تبھی انہیں خیال آتا کہ اس وقت وہ نقل نویسی نہیں کر رہے ہیں بلکہ سڑک پر چل رہے ہیں۔ گھر پہنچ کر وہ سیدھے کھانے کی میز کے پاس بیٹھ جاتے، شوربہ پیتے، گوشت کا ایک ٹکڑا اور پیاز کھاتے، اس کی پروا کئے بغیر کہ اس کا مزہ کیسا ہے اور اس پر مکھیاں یا خدا کا دیا ہوا اور بھی کچھ ہے۔ جب ان کا پیٹ تنے لگتا تو وہ میز سے اٹھ جاتے، ایک دوات لاتے اور گھر جو کاغذات لے آتے انہیں نقل کرنے بیٹھ جاتے۔ اگر ایسے کاغذات نہ ہوتے تو وہ محض اپنی خوشی کے لئے ایک نقل تیار کرتے اور خاص طور سے اگر دستاویز قابل ذکر ہوتی تو ضرور۔ اپنے اسلوب کی بلاغت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے مخاطب علیہ کی اہمیت یا نئے پن کے اعتبار سے۔

اس وقت بھی جب پیٹرس برگ کے سرمئی آسمان پر مکمل اندھیرا چھا جاتا ہے اور اس کے عہدیداروں کی پوری نسل کھا پی کر، اپنے اپنے طریقے، اپنی حیثیت اور مطبخی ترجیحات کے مطابق سیر ہو چکی ہوتی ہے اور اس کے سارے کلرک دن بھر کی قلم کی گھس گھس کے بعد، اپنے اور دوسرے محکموں کے ہنگاموں اور سارے فاضل اور غیر ضروری کام کے بعد جو بے چین طبیعتوں والے لوگ رضا کارانہ طور پر اپنے ذمے لے لیتے ہیں، آرام کر رہے ہوتے ہیں، جب عہدیداران فرصت کا باقی حصہ عیش و نشاط میں صرف کرنے کی جلدی میں ہوتے ہیں، زیادہ ہمت والے لوگ تھیٹر جاتے ہیں، کچھ لوگ سڑکوں پر گھومتے اور عورتوں کی طرحدار ٹوپوں کے نیچے تاکتے ہیں، کچھ لوگ کسی خوبصورت خاتون سے تعریفی کلمات کہنے میں شام گزارتے ہیں جو افسروں کے چھوٹے سے جھرسٹ میں ستارہ بنی ہوتی ہے، اور کچھ لوگ، جن کا یہ عام معمول ہوتا ہے، کسی ہمار کے تیسری یا چوتھی منزل والے فلیٹ کی طرف چل پڑتے ہیں جو دو چھوٹے کمروں اور پیش دالان اور باورچی خانے پر مشتمل ہوتا ہے اور کچھ فیشن ایبل چیزوں مثلاً کسی لیمپ یا ایسی ہی کسی اور چیز پر ناز کرتا ہے جو کئی وقت کا کھانا اور سیر قربان کر کے خریدی گئی ہوگی۔ مختصر یہ کہ اس وقت بھی جب سارے عہدیدار اپنے دوستوں کے چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں بٹ جاتے ہیں، تاش کھیلتے ہیں، گلاسوں میں چائے پیتے ہیں اور سستے رسک کھاتے ہیں، لمبے لمبے پائپ پیتے ہیں اور تاشوں کے بٹنے کے دوران میں اعلیٰ طبقے کی معاشرت کے بارے میں کوئی شرمناک قصہ سناتے ہیں جو عام روسی کے لئے ہمیشہ اور ہر حال میں بہت ہی پرکشش ہوتا ہے، یا جب کچھ اور بات کرنے کو نہیں ہوتی تو اس کمانڈانٹ کے بارے میں صدیوں پرانا لطیفہ سناتے ہیں جسے یہ رپورٹ دی گئی تھی کہ فالتو کے بنائے ہوئے پیٹراول کے یادگاری مجسمے کے گھوڑے کی دم سنوار دی گئی ہے، یعنی یہ کہ اس وقت بھی جب باقی دنیا تفریح کی فکر میں ہوتی ہے، اکاکی اکاکیٹیوچ کسی قسم کا اسراف نہیں کرتے تھے۔ کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے انہیں کسی پارٹی میں دیکھا تھا۔ جب نقل کرنے کی خوشی سے سیر ہو جاتے

تو کل کے بارے میں سوچتے ہوئے، کہ خدا نقل کرنے کے لئے کیا بھیجے گا، وہ سو جاتے۔ یہ تھی اس آدمی کی پراسن و پرسکون زندگی جو ۴۰۰ روپل کی تنخواہ پر صابروشا کر تھا، ایسی ہی شاید بڑھاپے تک جاری رہتی اگر کچھ ایسی بلائیں نہ آجائیں جو صرف خطابی ہی نہیں بلکہ خاص شاہی، اسٹیٹ اور دوسرے سارے کونسلروں اور قونصلوں کی بلکہ ان لوگوں کی قسمت میں بھی لکھی ہوتی ہیں جو مشورے دیتے ہیں نہ قبول کرتے ہیں۔

جن لوگوں کو چار سو روپل یا اس کے آس پاس تنخواہ ملتی ہے ان کا پیٹرس برگ میں ایک بھیانک دشمن رہتا ہے۔ یہ دشمن ہے ہمارا شمالی پالا۔ حالانکہ یہ بھی سنا جاتا ہے کہ یہ صحت کے لئے اچھا ہوتا ہے۔ آٹھ بجے صبح کو، یعنی جب سڑکیں اپنے اپنے محکموں کو جانے والے کلرکوں سے بھر جاتی ہیں تبھی یہ پالا بھی اپنا کام شروع کرتا ہے اور ساری ناکوں پر ایسے وار کرتا ہے کہ بیچارے کلرک انہیں چھپانے کی بڑی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں جب کہ اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والے بھی محسوس کرتے ہیں کہ ان کے چہرے کی جلد تن گئی ہے اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں، بیچارے خطابی کونسلر تو بالکل ہی بے بس ہوتے ہیں۔ بچنے کی واحد صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے پتلے بوسیدہ اوور کوٹوں میں پورے زور سے چار پانچ بلاک تک دوڑیں اور جب کسی دربان کی کوٹھری کی جائے پناہ تک پہنچ جائیں تو وہاں پاؤں پٹک پٹک کر اپنے منجمد ہنروں اور کلرکی قابلیتوں کو گرم کریں۔ ایک وقت ایسا آیا جب اکاکی اکاکیوچ کو پیٹھ اور کندھوں پر سردی کی خاص طور سے تیز چبھن محسوس ہونے لگی باوجود اس تیز رفتاری کے جس سے وہ ضروری فاصلے کو طے کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ آخر میں وہ سوچنے لگے کہ کہیں ان کے اوور کوٹ میں تو کچھ گڑبڑ نہیں۔ گھر پر اس کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد انہوں نے دریافت کیا کہ دو یا تین جگہوں پر یعنی پیٹھ اور کندھوں پر وہ گھس کر بالکل بوری کے کپڑے جیسے اور بالکل جھنا ہو گیا تھا اور اس کے نیچے کا استر تار تار ہو گیا تھا۔

یہاں ہمیں یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ اکاکی اکائیوچ کا اوور کوٹ بھی ان ساتھی کلرکوں کے مذاق کا تختہ مشق رہتا تھا۔ انہوں نے اس کو اوور کوٹ کہنا بھی بند کر دیا تھا اور اسے اوور آل کہنا شروع کر دیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ دیکھنے میں وہ بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ اس کا کالر برابر چھوٹا ہوتا گیا تھا اس لئے کہ اسے کاٹ کر دامن میں پیوند لگتے رہے تھے۔ یہ سرمست کا کام درزی کے فن کی کوئی بہت اچھی مثال نہ تھا اور جھولدار تھا اور بڑے خراب طریقے سے کیا گیا تھا۔ یوں مسئلے کی جڑ دریافت کرنے کے بعد اکاکی اکائیوچ نے طے کیا کہ اوور کوٹ کو درزی پترووچ کے پاس لیجانا پڑے گا جو کسی پچھواڑے والی سیڑھی کی چوتھی منزل پر رہتا تھا اور جو اپنے بھینگے پن اور چیچکرو ہونے کے باوجود عہدیداروں اور دوسرے گاہکوں کی پتلونیں اور ٹیل کوٹ سرمست کرنے میں خاصا ماہر تھا، یعنی ماہر جب وہ ہوش میں ہوتا اور اس کا چت کسی اور کام میں نہ لگا ہوتا۔ دراصل ہمیں اس درزی کے بارے میں زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن چونکہ اب یہ عام دستور ہے کہ کہانی کے ہر کردار کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے اس لئے کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ ہم پترووچ کو ذرا قریب سے دیکھیں۔

ابتدا میں اسے صرف گریگوری کہا جاتا تھا اور وہ کسی زمیندار کا کھیت غلام تھا۔ جب اس نے آزادی حاصل کی تو اپنا نام پترووچ رکھ لیا اور تہواروں کو جی کھول کر پینے لگا۔ پہلے تو صرف بڑے تہواروں کو پیتا تھا لیکن پھر بغیر کسی امتیاز کے جس دن بھی کلنڈر میں تاریخ پر صلیب کا نشان بنا ہوتا اس دن وہ ضرور پیتا۔ اس معاملے میں وہ ہمارے اجداد کی عادتوں کا تابع تھا۔ اور جب اپنی بیوی سے لڑتا تو اسے بے دین عورت اور جرمن کہتا۔ اور چونکہ اب ہم نے اس کی بیوی کا بھی ذکر کر دیا ہے اس لئے ہمیں اس کے بارے میں بھی چند لفظ کہنے پڑیں گے۔ بدقسمتی سے بیوی کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم۔ بس یہ معلوم تھا کہ پترووچ کے ایک بیوی ہے جو سر پر قصابہ باندھنے کی بجائے لیس کی ٹوپی پہنتی تھی۔ لیکن لگتا

ایسا ہے کہ وہ خود کو زیادہ حسین نہ کہہ سکتی تھی۔ بہر حال اس کے برابر سے جو لوگ گزرتے تھے ان میں صرف گارد کے سپاہی اس کی ٹوپی کی بٹ کے نیچے دیکھتے اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر عجیب سی آواز نکالتے۔

جب وہ پترووچ کی دکان تک جانے والی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ ان سیڑھیوں پر جو سچ یہ ہے کہ گندے پانی میں تر تھیں اور ہر جگہ ان سے وہ تیز اسپرٹ والی مہک نکل رہی تھی جو آنکھوں میں بھی لگتی ہے اور جو، قارئین جانتے ہی ہیں کہ، پیٹرس برگ میں ہر پچھواڑے والی سیڑھی کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ تو اکاکی اکاکیوچ قیاس کر رہے تھے کہ پترووچ کتنا مانگے گا اور انہوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ دو روبل سے زیادہ ہرگز نہ دیں گے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اس لئے کہ درزی کی نیک بیوی نے کوئی مچھلی پکانے کے سلسلے میں باورچی خانے میں اتنا دھواں بھر دیا تھا کہ تیل چٹے تک دکھائی نہ دیتے تھے۔ اکاکی اکاکیوچ درزی کی بیوی کے دیکھے بغیر باورچی خانے میں سے نکل گئے اور اس کمرے کی طرف گئے جہاں پترووچ کام کرتا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک بڑی سی بغیر پالش کی میز پر کسی ترک پاشا کی طرح دوزانو بیٹھا ہوا ہے۔ وہ ننگے پاؤں تھا جیسے کہ درزی عام طور سے کام کرتے وقت رہتے ہیں۔ اس کے پاؤں کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کا انگوٹھا تھا جس کو اکاکی اکاکیوچ پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ اس کا ناخن ٹیڑھا میڑھا اور کچھونے کی پشت کی طرح سخت تھا۔ پترووچ کی گردن میں ریشمی اور سوتی دھاگے کی لچھیاں لٹکی ہوئی تھیں اور اس کے گھٹنوں پر کپڑے کے چند ٹکڑے رکھے تھے۔ پچھلے تین سنٹ سے وہ سوتی میں دھاگا ڈالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور اس لئے کمرے میں اندھیرا ہونے پر اور خود دھاگے پر بہت خفا تھا اور بڑبڑا رہا تھا ”پڑ بھی جا، لعنتی! کافی ہے پاگل کر دینے کے لئے لفنگا کہیں کا!،“ اکاکی اکاکیوچ یہ دیکھ کر بڑے پریشان ہوئے کہ وہ ایسے وقت پہنچے جب پترووچ غصہ میں تھا۔ وہ ایسے وقت آرڈر دینا پسند کرتے تھے جب پترووچ کی ہمت ذرا پست ہوتی تھی یا جیسا کہ اس کی بیوی کہا کرتی تھی ”پھر ہی رہا تھا، کانا شیطان!،“

ایسی حالت میں پترووچ اپنے گاہک کی بات بڑی خوشی سے مان لیتا، جھک جھک کر اور شکریہ ادا کر کر کے وہ راضی ہو جاتا۔ یہ سچ ہے کہ بعد کو اس کی بیوی شکایت کرتی ہوئی آتی کہ اس کا شوہر نشے میں تھا اس لئے وہ بہت سستے میں کام کرنے پر تیار ہو گیا۔ لیکن عام طور سے آپ کو ۱۰ کوپک اور زیادہ نکالنے پڑتے اور بس کام بن جاتا۔ مگر اس وقت تو پترووچ بالکل ہوش میں دکھائی دے رہا تھا اس لئے وہ دوٹوک اور ہٹی ہوگا اور خاصے جھگڑالو دام مانگ سکتا تھا۔ اکاکی اکاکیٹیوچ نے صورت حال کا جائزہ لیا اور وہ واپس چلے جانا چاہتے تھے لیکن اس کی گنجائش نہ رہ گئی تھی۔ پترووچ نے اپنی صحیح آنکھ ان کی طرف اٹھائی اور گھور کر دیکھنے لگا۔

اکاکی اکاکیٹیوچ نے خود بخود کہہ دیا ”روز بخیر پترووچ!“، جس پر سوخرالذکر نے جواب دیا ”روز بخیر، جناب عالی!“، اور اس نے اپنی آنکھ اکاکی اکاکیٹیوچ کے ہاتھ پر سرکوز کی، یہ دیکھنے کے لئے کہ کیسا مال لایا جا رہا ہے۔

”میں... بس آ گیا تھا۔ وہ یہ کوٹ ہے نہ...“

اس جگہ ہمیں یہ بتا دینا چاہئے کہ اکاکی اکاکیٹیوچ زیادہ تر اپنی بات حروف جار، اسم حال اور ہر قسم کے ایسے اسماء و حروف میں ادا کرتے تھے جن کے معنی کچھ نہیں ہوتے۔ اور موقع اگر خاص طور سے مشکل کا ہوتا تو وہ اپنے جملے پورے ہی نہ کرتے تھے اور اکثر اس طرح کے فقرے کہنے کے بعد جیسے ”سچ یہ ہے کہ درحقیقت...“، وہ اور کچھ نہ کہتے اور وہ خود بھول جاتے اور یہ سمجھتے کہ پوری بات کہہ دی۔

”کیا ہے یہ؟“، پترووچ نے کہا اور ساتھ ہی اپنی واحد صحیح آنکھ سے اچھی طرح وردی کا معائنہ کیا، کالر سے آستینوں پر ہوتے ہوئے پیٹھ، دامن اور کاجوں کو دیکھا۔ یہ سب اس کے جانے پہچانے تھے اس لئے کہ سب اسی کام تھا۔ یہ درزیوں کا دستور ہے اور کسی گاہک سے سامنا ہوتے ہی پہلی چیز وہ یہی کرتے ہیں۔

”وہ میں اس لئے، پترووچ... یہ میرا اوور کوٹ، کپڑا تو... دیکھو ذرا، دوسری جگہوں پر تو خاصا مضبوط ہے، بس ذرا گندہ

ہے اور پرانا سا لگتا ہے، لیکن دراصل نیا ہی ہے بس یہاں ایک جگہ پر یہ ذرا... پیٹھ پر اور ایک کندھے پر... ذرا گھس گیا ہے اور اس کندھے پر بھی... یہ دیکھو، بس۔ تھوڑا ہی کام ہے...،

پترووچ نے اوورآل کو لیا، اسے سبز پر پھیلایا، اچھی طرح اس کا معائنہ کیا، سر ہلایا اور جھک کر کھڑکی پر سے نسوار کی گول ڈبیا اٹھائی جس پر کسی جنرل کی تصویر بنی تھی لیکن یہ پتہ نہیں کہ کس جنرل کی اس لئے کہ جہاں سر تھا وہیں کسی نے انگلی دھنسا دی تھی اور اب اس چھید کو کاغذ کے چوکور ٹکڑے سے ڈھک دیا گیا تھا۔ ایک چٹکی نسوار لے کر پترووچ نے کوٹ کو اپنے ہاتھوں پر پھیلایا اور روشنی کے سامنے کیا۔ ایک بار پھر اس نے اپنا سر ہلایا۔ پھر الٹ کر استر دیکھا اور ایک بار اور سر ہلایا، ایک بار پھر نسوار کی ڈبیا اٹھائی اور اس کا ڈھکنا کھولا جس پر کاغذ کے ٹکڑے سے ڈھکی ہوئی جنرل کی تصویر تھی اور نتھنے میں ایک چٹکی نسوار لے کر ڈھکنا بند کیا، ڈبیا اس کی جگہ پر رکھی اور بالآخر اعلان کیا:

”نہیں، اسے ٹھیک نہیں کیا جا سکتا۔ کپڑا بالکل بیکار ہو گیا!“

یہ سن کر اکاکی اکاکیوچ کا تو دل بیٹھ گیا۔ انہوں نے بالکل بچے کی طرح منت کرتے ہوئے کہا:

”کیسے نہیں کیا جا سکتا، پترووچ؟ میرا مطلب ہے بس کندھوں ہی پر تو ہے، تمہارے پاس کوئی نہ کوئی ٹکڑا تو ہوگا ہی...،“

پترووچ نے کہا: ”ہاں ٹکڑے تو مل جائیں گے، ٹکڑوں کی کوئی بات نہیں۔ لیکن انہیں سینا تو ناممکن ہے۔ کپڑا بالکل گل گیا ہے۔ اس میں سوئی دھنساؤ اور وہ نکل پڑے گا۔“

”تو نکل آنے دو تب تم اس پر سیدھے سیدھے پیوند لگا سکتے ہو۔“

”ہاں مگر کچھ ہے نہیں جس پر پیوند لگایا جائے۔ پیوند کو پکڑنے کے لئے کچھ نہیں ہے، بہت گھسا ہوا ہے۔ کہنے کو تو یہ کپڑا ہے لیکن تیز ہوا کے سامنے کر دیجئے اور تارتار ہو کر اڑ جائے گا۔“

”لیکن کسی طرح اس کی مضبوطی کرو۔ ایسا کیسے ہے کہ درحقیقت!...“

”نہیں،“ پترووچ نے فیصلہ کن انداز میں کہا ”کچھ بھی کرنا ناممکن ہے۔ کام بالکل بگڑ چکا ہے۔ اچھا تو یہ ہوگا کہ جاڑے آئیں تو اسے کاٹ کے پاؤں میں لپیٹنے کے لئے پٹیاں بنا لیجئے اس لئے کہ سوزوں سے تو پاؤں گرم ہوتے نہیں۔ وہ تو جرمنوں نے ایجاد کر دئے لوگوں سے زیادہ روپیہ اینٹھنے کے لئے،“ جرمنوں پر چوٹ کرنے کا کوئی موقع پترووچ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ ”اور یہ تو صاف ہے کہ اوور کوٹ آپ کو نیا بنوانا پڑے گا۔“ ”نیا،“ لفظ سنتے ہی اکاکی اکاکیٹیوچ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور کمرے کی ہر چیز تیرنے سی لگی۔ بس واحد چیز جسے وہ صاف دیکھ سکتے تھے وہ تھی پترووچ کی نسوار کی ڈبیا پر جنرل کی تصویر جس کے چہرے پر کاغذ چپکا ہوا تھا۔ انہوں نے جیسے نیند سے چونکتے ہوئے پوچھا ”نیا کیسے؟“ سیرے پاس تو اس کے لئے پیسے بھی نہیں ہیں۔“

”ہاں، نیا،“ پترووچ نے بڑے تکلیف دہ سکون کے ساتھ کہا۔ ”اور اگر نیا ہی بنوانا پڑا تو وہ سیرا مطلب ہے کہ دراصل...“ ”یعنی کتنے کا ہوگا؟“ ”ہاں۔“

”یہی ڈیڑھ سو تو کم سے کم لگانے ہی پڑیں گے،“ پترووچ نے معنی خیز انداز میں ہونٹ بھینچ کر کہا۔ اسے پرزور اثر ڈالنا بہت پسند تھا، ایسی باتیں کہنے کا شوق تھا کہ سننے والا سکتے میں آجائے اور پھر وہ اپنے حیران سامع کے چہرے پر ان لفظوں کا اثر کنکھیوں سے دیکھتا تھا۔

”اوور کوٹ کے لئے ڈیڑھ سو روبل!،“ اکاکی اکاکیٹیوچ چلا پڑے۔ شاید زندگی میں پہلی بار انہوں نے اپنی آواز اونچی کی تھی۔ ویسے وہ بہت ہی نرم اور مدہم آواز میں بولتے تھے۔ ”جی ہاں،“ پترووچ نے کہا ”اور اوور کوٹ تو اس سے بھی زیادہ کا ہو سکتا ہے۔ اگر مارٹین کے فر کا کالر لگا دیجئے اور ریشمی استروالا سرپوش اس کے ساتھ ہی سلوا دیجئے۔ تو دو سو کا ہو سکتا ہے۔“

”پترووچ، ذرا مہربانی!،، اکاکی اکاکیٹیوچ نے منت کرنے کے لہجے میں کہا۔ انہوں نے پترووچ کی باتیں اور اس کے سب موثر الفاظ نہیں سنے اور سننا بھی نہیں چاہتے تھے ”کسی طرح ٹھیک کر دو تاکہ تھوڑا بہت اور کام دے جائے،،۔

”نہیں، سیری محنت بھی برباد ہوگی اور آپ کا پیسہ بھی،، پترووچ نے کہا اور یہ آخری فیصلہ سن کر اکاکی اکاکیٹیوچ دل شکستہ ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

اپنے گاہک کے جانے کے بعد پترووچ کافی دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا، اپنے ہونٹ معنی خیز انداز میں بھینچے رہا اور اس نے کام نہیں شروع کیا اس لئے کہ وہ اپنے آپ سے بہت خوش تھا کہ اس نے اپنا نقصان بھی نہیں کیا اور درزی کے فن کو بھی نہیں گرایا۔

سڑک پر نکل کر اکاکی اکاکیٹیوچ کو لگا کہ جیسے وہ خواب دیکھ رہے ہیں۔

انہوں نے اپنے آپ سے کہا: ”تو یوں ہے معاملہ، اور میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ یہ نوبت آچکی ہے...“ پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولے ”تو یہ ہے صورت! یہ ہوا آخر کار! اور سچ سچ میں تو تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ یہ صورت ہے!،، اس کے بعد وہ پھر چپ ہو گئے، دیر تک چپ رہے، اور بولے ”خیر، پھر یوں ہی سہی، اب یہ دیکھئے کہ یہ تو بالکل ہی غیر متوقع... ایسا تو نہیں سمجھا تھا... کیا مشکل ہو گئی بیٹھے بٹھائے!،، یہ کہہ کر وہ گھر کی طرف نہیں بلکہ بالکل مخالف سمت میں چل پڑے۔ انہیں احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کر کیا رہے ہیں۔ راستے میں ایک چمنی صاف کرنے والا گندہ آدمی ان سے ٹکرا گیا اور ان کا کندھا بالکل سیاہ ہو گیا۔ ایک زیر تعمیر مکان کی سب سے اوپر والی منزل پر سے ان پر پوری ٹوپی بھر چونا گر پڑا۔ وہ اس سب سے بے خبر تھے۔ وہ تو جب ایک پولیس والے سے ٹکرائے، جس نے اپنی تمباکو کی سینگ میں سے کچھ نسوار جھاڑ کر نکالنے کے لئے اپنی تیر رکھ دی تھی، تب وہ ذرا ہوش میں آئے اور وہ بھی اس لئے کہ پولیس والے نے کہا ”یہ تم جا کہاں رہے ہو؟ فٹ پاتھ پر تمہارے لئے کافی جگہ نہیں ہے کیا؟،، اس پر انہوں

نے ادھر ادھر نظر ڈالی اور گھر کی طرف واپس مڑے۔ اب انہوں نے اپنے خیالات کو یکجا کرنا شروع کیا اور اپنی حالت کو مناسب روشنی میں دیکھا۔ انہوں نے اپنے آپ سے اپنے اکھڑے اکھڑے لہجے میں نہیں بلکہ صاف صاف اور سمجھ میں آنے والے انداز میں بات کی جیسے آدمی اپنے کسی معقول دوست سے بات کرتا ہے جس کے ساتھ انتہائی ذاتی اور نازک معاملوں پر بھی باتیں کی جا سکتی ہیں۔

اکاکی اکاکیٹیوچ نے کہا: ”اب پترووچ سے بحث کرنے سے تو کوئی فائدہ نہیں۔ وہ آج ذرا... لگتا ہے بیوی نے اس کی کچھ سرست کردی ہے۔ اچھا یہ ہوگا کہ میں اس کے پاس اتوار کی صبح کو جاؤں۔ سنیچر کی شام کے بعد اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی ہوں گی اور وہ آدھا سو رہا ہوگا اور سر کے لئے شراب کی ضرورت ہوگی اور بیوی اسے پیسے دے نہیں رہی ہوگی اور تب میں اسے دس کوپک ٹکاؤں گا۔ تب وہ عقل کی بات سنے گا اور یہ اوورکوٹ سمجھئے کہ...“

اس طرز استدلال سے اکاکی اکاکیٹیوچ نے خود کو پھسلا لیا اور اگلے اتوار کو انہوں نے تب تک انتظار کیا جب تک پترووچ کی بیوی کسی کام سے گھر سے چلی نہیں گئی۔ تب وہ سیدھے پترووچ کے پاس پہنچ گئے۔ سچ سچ سنیچر کے بعد پترووچ کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور وہ فرش پر سر ٹکائے ہوئے بالکل نیند میں پڑا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جیسے ہی اسے اکاکی اکاکیٹیوچ کے آنے کا مقصد معلوم ہوا ویسے ہی جیسے شیطان نے اس کو ٹھوکا لگا دیا۔

کہنے لگا ”ناممکن ہے۔ اب تو نئے کا آرڈر دیجئے!“ اس پر اکاکی اکاکیٹیوچ نے اس کو دس کوپک کا ایک سکہ تھما دیا۔

پترووچ نے کہا: ”جناب عالی، آپ کا بہت شکریہ، آپ کی صحت کے نام پر تھوڑا سا اپنے آپ کو مضبوط بنا لوں گا۔ لیکن اس اوورکوٹ کے بارے میں آپ پریشان نہ ہوں۔ اب اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ میں آپ کو نیا اوورکوٹ بڑا شاندار بنا دوں گا۔ بس یہیں یہ بات ختم۔“

اکاکی اکاکیٹیوچ ابھی سرت کی بات ختم نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن پترووچ نے ان کی پوری بات سنی بھی نہیں اور کہا :
 ”میں نے کہا نہ کہ میں نیا آپ کے لئے ضرور ضرور سی دوں گا۔
 یہ طے سمجھئے، بہترین سلائی کروں گا، اس کا یقین رکھئے۔ آپ
 چاہیں تو بالکل نئے فیشن کا بھی ہو سکتا ہے، کالر کوالگ سے
 اپلیکے * لگا کر چاندی کے بکسوؤں سے ٹانگ دوں گا۔“

اب اکاکی اکاکیٹیوچ نے دیکھا کہ نئے اوور کوٹ کے بغیر کام نہیں
 چلے گا اور وہ بالکل ہی دل شکستہ ہو گئے۔ آخر وہ اس کی قیمت کہاں
 سے ادا کریں گے۔ روپیہ کہاں سے لائیں گے؟ خیر ایک حد تک تو
 وہ بونس پر بھروسا کر سکتے ہیں جو اگلے تہوار پر ملے گا
 لیکن اس رقم کا تو پہلے ہی حساب لگ چکا تھا اور پہلے ہی سے بعض
 اخراجات کے لئے مخصوص کی جا چکی تھی۔ انہیں نئی پتلون کی ضرورت
 تھی، جوتے بنانے والے کو پرانے جوتوں کا اپلا بدلنے کا بل ادا کرنا
 تھا جو کافی دنوں سے قرض تھا، سلائی کرنے والی سے تین نئی قمیصیں
 بنوانی تھیں اور اندر پہننے کے دو کپڑے جن کا نام چھپی ہوئی
 کتاب میں لکھنا ناشائستہ سمجھا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس رقم میں
 سے کچھ نہیں بچے گا اور اگر ڈائرکٹر نے بڑی فیاضی کی اور چالیس
 روپل کی بجائے پینتالیس یا پچاس بھی دے دئے تو تھوڑی سی رقم
 بچے گی جو اوور کوٹ کے لئے درکار رقم کے سمندر میں ایک بوند کی
 طرح ہوگی۔ اگرچہ انہیں معلوم تھا کہ پترووچ بہت زیادہ دام بتانے کا
 عادی تھا جو کبھی کبھی تو اتنے زیادہ ہوتے کہ اس کی بیوی سے
 بھی برداشت نہ ہوتا اور وہ پکار اٹھتی ”ارے تیرا کیا دماغ چل گیا
 ہے، حد ہے بیوقوفی کی! کبھی تو مفت میں کام ہاتھ میں لے لے گا
 اور اس وقت دیکھو کیسے دام اتنی آسانی سے مانگ رہا ہے، ارے
 اتنی تو تیری اوقات بھی نہیں ہے،“۔ اکاکی اکاکیٹیوچ کو یقین تھا
 کہ پترووچ اسی روپل میں کوٹ بنا دے گا پھر بھی انہیں یہ اسی روپل
 کہاں سے ملیں گے؟ اس کی آدھی رقم تو مہیا ہو سکتی تھی، شاید
 تھوڑی زیادہ بھی، لیکن باقی آدھی کہاں سے آئے گی؟.. قاری کو
 یہ معلوم ہونا چاہئے کہ پہلی آدھی رقم کہاں سے آنے والی تھی۔ بات

* چاندی کی آرائش - (ایڈیٹر)

یہ ہے کہ اکاکی اکاکیٹیوچ کی عادت تھی کہ جو روبل بھی وہ خرچ کرتے اس میں سے دو کوپک بچا لیتے اور ایک چھوٹی سی قفل دار صندوقچی میں ڈال دیتے جس میں اوپر ایک چھید کٹا ہوا تھا۔ ہر چھٹے مہینے وہ جمع شدہ سکوں کو گنتے اور انہیں نکال کر اتنے ہی چاندی کے سکے رکھ دیتے۔ یہ برسوں سے ان کا دستور تھا اور اب تک انہوں نے چالیس روبل سے زیادہ بچائے تھے۔ اس طرح آدھی رقم تو تھی لیکن باقی آدھی کہاں سے لائیں؟ اکاکی اکاکیٹیوچ سوچتے رہے اور سوچ بچار کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں اپنے روزمرہ اخراجات میں کمی کرنی پڑے گی، کم سے کم سال بھر تک انہیں شام کی چائے کی پیالی چھوڑنی پڑے گی، شام کو سومبتی جلانا بند کرنا پڑے گا اور اگر کچھ کام کرنا ہوگا تو وہ مکان مالکن کے کمرے میں جا کر ان کی سومبتی کی روشنی میں کریں گے، جب چلیں گے تو انہیں پتھروں اور روڑیوں پر احتیاط کے ساتھ آہستہ چلنا ہوگا تا کہ ان کے جوتے نہ گھسیں، کپڑے جہاں تک ہو سکے کم دھلوانے ہوں گے اور ان کو زیادہ دن چلانے کے لئے گھر پہنچتے ہی کپڑے اتار کر اپنا سستا سوتی ڈریسنگ گاؤن پہن لینا ہوگا جو بہت پرانا تھا اور جس سے خود وقت بھی دستبردار ہو گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ شروع میں انہیں خود کو ایسی پابندیوں کا عادی بنانے میں بڑی مشکل ہوئی لیکن پھر وہ ان کے عادی ہو گئے اور یہی معمول بن گیا۔ وہ اس کے بھی عادی ہو گئے کہ شام کو بالکل ہی کھانا نہ کھائیں لیکن اس کی جگہ انہیں روحانی تغذیہ ملا، آئندہ اوور کوٹ کے دائمی تصور کو انہوں نے اپنے خیالات میں بسا لیا۔ اب ان کا وجود زیادہ بھرا پرا لگنے لگا جیسے انہوں نے بیاہ کر لیا ہو، جیسے ان کے ساتھ کوئی دوسری ہستی ہو، جیسے وہ اکیلے نہ ہوں بلکہ کوئی موہنی دوست زندگی کا راستہ ان کے ساتھ طے کرنے پر راضی ہو گئی ہو۔ اور یہ دوست کوئی اور نہیں بلکہ وہی اوور کوٹ تھا جس کے اندر موٹی روٹی کی تہ تھی اور جس کا استر دیرپا اور مضبوط تھا۔ وہ کچھ اور جاندار سے ہو گئے اور کردار کے زیادہ پختہ، ایک ایسے انسان کی طرح جس نے زندگی میں اپنا نصب العین طے کر لیا ہو۔ ان کے چہرے اور برتاؤ سے بے یقینی اور تذبذب یعنی ان کا مبہم اور گومگوا لا انداز بالکل غائب ہو گیا۔ کبھی کبھی ان کی آنکھیں

روشن ہو جاتیں اور ان کے ذہن میں جری ترین اور اہم ترین خیالات بھی آتے، شاید وہ مارٹین کے فر کا کالر لگوا ہی لیں۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ اپنے خیالوں میں بالکل ہی کھو جاتے اور ایک دن نقل کرنے میں انہوں نے تقریباً ایک غلطی کردی اور ان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ”یا خدا!،“ اور انہوں نے اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا۔ ہر مہینے میں کم سے کم ایک بار وہ پترووچ کی دکان پر جاتے اور اوور کوٹ کے بارے میں باتیں کرتے، پوچھتے کہ کپڑا خریدنے کے لئے سب سے اچھی جگہ کون سی ہوگی اور کس رنگ کا کپڑا خریدنا چاہئے اور کس قیمت پر اور وہ خوش خوش گھر آتے، تھوڑا فکرمند ہوتے لیکن اس خیال سے مطمئن ہوتے کہ آخر کار وہ وقت آئے گا جب وہ سچ سچ یہ خریداری کر سکیں گے اور اوور کوٹ تیار ہو جائے گا۔ یہ وقت ان کی توقع سے بھی پہلے آگیا۔ ساری توقعات کے برخلاف ڈائریکٹر نے اکاکی اکاکیوچ کو چالیس نہیں، پینتالیس نہیں بلکہ پورے ساٹھ روبل بونس کے طور پر دئے۔ شاید انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اکاکی اکاکیوچ کو اوور کوٹ کی سخت ضرورت ہے، یا بس ویسے ہی یہ ایک اتفاق ہو گیا لیکن اس کی بدولت اکاکیوچ کے پاس بیس روبل فاضل ہو گئے۔ اس صورت حال نے معاملے کے آگے بڑھنے کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ مزید دو تین مہینے کی کفایت شعاری کے بعد اکاکیوچ کے پاس رقم تیار ہو گئی۔ ان کا دل، جو ویسے بہت پرسکون رہتا تھا، تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اگلے ہی دن وہ پترووچ کو لیکر دکانوں میں گئے اور انہوں نے بہت اچھا کپڑا خریدا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اس لئے کہ اس خریداری کے بارے میں وہ چھ مہینے سے سوچتے آرہے تھے اور شاید ہی کوئی مہینہ گزرا ہو جب وہ دکان میں نہ گئے ہوں اور انہوں نے قیمتوں کا موازنہ نہ کیا ہو۔ خود پترووچ نے کہا کہ اس سے اچھا کپڑا انہیں کہیں نہیں مل سکتا۔ استر کے لئے انہوں نے سوئی کپڑا لیا لیکن اتنی اچھی قسم کا اور اتنا مضبوط کہ، پترووچ کے لفظوں میں، وہ ریشمی کپڑے سے زیادہ اچھا اور زیادہ چمکدار بھی تھا اور دیکھنے میں عمدہ معلوم ہوتا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ مارٹین کا فر نہیں لیں گے اس لئے کہ وہ بہت مہنگا تھا بلکہ اس کی بجائے انہوں نے بہترین بلیوں کی کھالیں لیں، ایسی کھالیں جو دور

سے دیکھنے پر بالکل سارٹین جیسی لگتی تھیں۔ پترووچ نے اوور کوٹ سینے میں پورے دو ہفتے لگائے اس لئے کہ روئی کی تہ جمانے کا کام بہت تھا ورنہ تو جلدی ختم ہو جاتا۔ پترووچ نے سلائی کے بارہ روبل لئے۔ اس سے ایک کوپک بھی کم ہیں نہیں ہو سکتا تھا، ہر چیز ریشمی دھاگے سے سی گئی تھی، سہین ٹانگوں کی دوہری سلائی اور بعد کو ہر سلائی پر پترووچ نے خود اپنے دانتوں سے کام کیا اور انہیں مختلف آرائشی شکلیں دیں۔

جس دن پترووچ آخر کو وہ اوور کوٹ لایا... یہ کہنا مشکل ہے کہ ٹھیک ٹھیک وہ کون سا دن تھا لیکن غالباً وہ اکاکی اکیٹیوچ کی زندگی کا سب سے یادگار دن تھا۔ پترووچ اوور کوٹ صبح کو لایا، ایسے وقت کہ اکاکی اکیٹیوچ اسے پہن کر کام پر جا سکیں۔ اوور کوٹ اور کسی وقت لایا جاتا تو کبھی اتنا بروقت نہ ہوتا اس لئے کہ سخت پالے بس شروع ہی ہوئے تھے اور خطرہ یہ تھا کہ سردی اور بڑھ جائے گی۔ پترووچ اوور کوٹ لے کر خود آیا تھا جیسا کہ اچھے درزی کو زیب دیتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی جیسی اکاکی اکیٹیوچ نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اپنے کام کی اہمیت کا احساس کر کے وہ اس زبردست فرق کو سمجھ گیا تھا جو ان درزیوں میں جو بس استر لگا دیتے ہیں اور مرست کرتے ہیں اور ان درزیوں میں ہوتا ہے جو نئے لباس تخلیق کرتے ہیں۔ اس نے اوور کوٹ کو اس رومال میں سے نکالا جس میں لپیٹ کر اسے لایا تھا، رومال بھی دھالا ہوا تھا۔ اسے تہ کر کے پترووچ نے اپنی جیب میں رکھا آئندہ استعمال کے لئے۔ اوور کوٹ کو ہاتھوں میں لے کر اس نے اسے بڑے فخر کے ساتھ دیکھا اور ہاتھوں کی ایک ماهرانہ جنبش سے اسے اکاکی اکیٹیوچ کے کندھوں پر ڈال دیا، اسے ٹھیک کیا، پیٹھ پر برابر کیا اور بالآخر بٹن کھلے ہی کھلے اسے اکاکی اکیٹیوچ کے گرد لپیٹ دیا۔ اکاکی اکیٹیوچ پکی عمر کے آدمی کی طرح اسے قاعدے سے پہننا چاہتے تھے۔ پترووچ نے انہیں آستینیں پہننے میں سہارا دیا اور اس طرح بھی وہ بالکل فٹ آگیا۔ بہ الفاظ دیگر اوور کوٹ بالکل درست اور فٹ تھا۔ پترووچ نے یہ کہنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا کہ وہ ایک چھوٹی سی گلی میں رہتا ہے اور اس کی دکان کا کوئی سائن بورڈ بھی نہیں ہے، اور پھر اکاکی

اکاکیٹیوچ اس کے پرانے گاہک ہیں اس لئے اس نے ان سے اتنے کم
 پیسے لئے ورنہ نیوسکی پراسپیکٹ پر تو انہیں صرف سلائی ہی کے
 پچھتر روپل دینے پڑتے۔ اکاکی اکاکیٹیوچ اس مسئلے پر پترووچ کے
 ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے کہ انہیں بڑی بڑی رقمیں
 سن کر ڈر لگتا تھا جو پترووچ اپنے گاہکوں کو سکتے ہیں ڈالنے
 کے لئے دوہراتا رہتا تھا۔ انہوں نے اس کو سلائی کی رقم دی،
 شکریہ ادا کیا اور اپنا نیا اوورکوٹ پہن کر اپنے محکمے کی طرف
 چل پڑے۔ پترووچ بھی ان کے ساتھ ہی نکلا اور سڑک پر دیر
 تک کھڑا اور آگے جاتے ہوئے اوورکوٹ کو دیکھتا رہا اور پھر
 جان بوجھ کر ایک ٹیڑھی سیڑھی گلی میں چکر کاٹ کر وہ اسی سڑک
 پر اور آگے نکل آیا جہاں سے اسے اوورکوٹ کو دوبارہ دیکھنے کا
 موقع مل گیا، اور اس بار ایک اور زاویے سے، سامنے سے۔ اکاکی
 اکاکیٹیوچ اتنے خوش خوش چلے جا رہے تھے جیسے کوئی تہوار ہو۔
 ہر منٹ اور ہر لمحہ انہیں احساس تھا کہ وہ نیا اوورکوٹ پہنے
 ہوئے ہیں اور دو ایک بار تو وہ مارے خوشی کے خود بخود مسکرا
 بھی پڑے۔ دراصل اوورکوٹ کے دو فائدے تھے، ایک تو وہ گرم تھا
 اور دوسرے دیکھنے میں اچھا لگتا تھا۔ انہیں راستے کا کوئی احساس
 ہی نہیں ہوا اور اچانک انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنے محکمے میں
 پہنچ گئے ہیں۔ غلام گردش میں انہوں نے اوورکوٹ اتارا، اسے ہر
 طرف سے دیکھا بھالا اور اسے خاص طور سے خدمتگار کے حوالے کیا۔
 معلوم نہیں کس طرح سے محکمے میں ہر شخص کو پتہ چل گیا کہ
 اکاکی اکاکیٹیوچ نیا اوورکوٹ پہن کر آئے ہیں اور اب اوورآل نہیں
 رہا۔ وہ سب بھاگ کر غلام گردش میں اکاکی اکاکیٹیوچ کا
 اوورکوٹ دیکھنے آئے۔ سب لوگوں نے انہیں مبارکباد دی اور ان سے
 خلوص و محبت کا اظہار کیا۔ شروع میں تو اکاکی اکاکیٹیوچ
 مسکراتے رہے لیکن بعد میں وہ جھینپنے لگے۔ اور جب ان سب نے
 یہ مطالبہ کرنا شروع کیا کہ اس مبارک موقع پر جشن منانا
 چاہئے اور وہ کم سے کم یہ کر سکتے ہیں کہ سب کو پارٹی دیں
 تو اکاکی اکاکیٹیوچ بوکھلا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا
 کہ اس سے کیسے چھٹکارا حاصل کریں۔ چند منٹ کے بعد انہوں نے
 شرم سے گلابی ہو کر بڑے بھولپن سے سب کو یقین دلانا شروع

کیا کہ یہ نیا اوور کوٹ نہیں تھا، یہ تو ان کا پرانا ہی والا ہے۔
آخر ایک عہدیدار نے جو ہیڈ کلرک کا اسسٹنٹ تھا، غالباً یہ جتانے
کے خیال سے کہ وہ مغرور ہرگز نہیں بلکہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ
بھی گھلنے ملنے پر تیار ہے، اعلان کیا کہ ”چلیے یوں سہی، اکاکی
اکاکیٹیوچ کی طرف سے میں پارٹی دیتا ہوں اور آپ سب کو مدعو
کرتا ہوں کہ آج شام کو میرے ساتھ چائے پینے کے لئے میرے ہاں
تشریف لائیے۔ حسن اتفاق سے آج میری سالگرہ بھی ہے۔“

قدرتی بات ہے سارے عہدیداروں نے فوراً اسسٹنٹ ہیڈ کلرک
کو مبارکباد دی اور دعوت کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اکاکی اکاکیٹیوچ
نے معذرت کرنے کی کوشش کی لیکن ان سب نے کہا کہ یہ خلاف
تہذیب بات ہے اور انہیں اپنے اوپر شرم آنی چاہئے۔ ان کے لئے
دعوت قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ مزید برآں جب
انہیں یہ احساس ہوا کہ اس طرح انہیں اپنے نئے اوور کوٹ کی ایک بار
اور نمائش کرنے کا موقع مل جائے گا، اس بار شام کو، تو انہیں
خوشی ہوئی۔ اکاکی اکاکیٹیوچ کے لئے یہ پورا دن سب سے زیادہ
دل خوش کن تہوار تھا۔ وہ بہت ہی خوش خوش گھر واپس آئے،
اپنا اوور کوٹ اتار کر انہوں نے احتیاط سے اسے کھونٹی پر ٹانگا،
کپڑے اور استر کو ایک بار پھر پیار سے دیکھا اور پھر اپنا
پرانا ”اوور آل“ نکال کر، جو اب تک بالکل بوسیدہ ہو چکا تھا، دونوں
کا موازنہ کیا۔ اسے دیکھ کر وہ زور سے ہنس پڑے، کس قدر
زبردست فرق ہے! اور اس کے بعد کافی دیر تک، کھانے کے دوران
میں، رہ رہ کر اپنے پرانے اوور آل کی خستہ حالت کو یاد کرتے اور
مسکراتے رہے۔ انہوں نے خوب مزہ لیکر کھانا کھایا اور بعد کو
نقل نویسی کا کوئی کام نہیں کیا۔ اس کی بجائے سیبارس* کے
لوگوں کی طرح اندھیرا ہونے تک اپنے بستر پر اینڈنے کو ترجیح
دی۔ پھر مزید تاخیر کئے بغیر انہوں نے کپڑے پہنے، اپنا نیا
اوور کوٹ کندھوں پر ڈالا اور سڑک پر نکل آئے۔ جس عہدیدار
نے پارٹی دی تھی وہ صحیح صحیح کہاں رہتا تھا یہ بدقسمتی سے

* سیبارس — جنوبی اٹلی میں قدیم یونان کا مقبوضہ جہاں کے
مالدار لوگ آرام طلبی اور عیش پسندی کے لئے مشہور تھے۔ (ایڈیٹر)

میں نہیں بتا سکتا۔ میرا حافظہ مجھے بری طرح دھوکا دے رہا ہے اور پیٹرس برگ کی ہر چیز، اس کی سڑکیں اور عمارتیں تک میرے ذہن میں ایسی گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ وہاں سے کسی بھی چیز کو صحیح شکل میں نکالنا بہت ہی مشکل ہے۔ جو میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ عہدیدار شہر کے زیادہ اچھے حصے میں رہتا تھا جو اکاکی اکیٹیوچ کے کہیں آس پاس بھی نہ تھا۔ پہلے اکاکی اکیٹیوچ کو کچھ اجاڑ اور دھندلی روشنی والی سڑکوں پر جانا پڑا لیکن جیسے جیسے وہ عہدیدار کے گھر سے قریب آتے گئے ویسے ویسے سڑکیں زیادہ بارونق، زیادہ آباد اور زیادہ روشن ہوتی گئیں۔ سڑکوں پر زیادہ راہ گیر ملنے لگے جن میں خوش پوش خواتین اور سمور کے کاروالے مرد بھی تھے اور سستے گاڑیاں کم تھے جن کی برف پر چلنے والی گاڑیوں پر لکڑی کے تختے ہوتے تھے اور جن کی سجاوٹ پیتل کی کیلوں سے کی ہوتی تھی۔ ان کی جگہ قرمزی مخملی ٹوپیوں والے بانکے گاڑیاں تھے جن کی برف گاڑیاں وارنش کئے ہوئے پھٹوں پر پھسلتی چلی جاتی تھیں اور گاڑیوں میں بھالو کی کھالیں بچھی ہوتی تھیں یا پھر خوش رنگ بگھیاں تھیں جن کے پہیے برف پر چلتے ہوئے چرمراتے تھے۔ اکاکی اکیٹیوچ ان سب چیزوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کئی برسوں سے وہ شام کو سڑک پر نکلے ہی نہ تھے۔ وہ ایک دکان کی روشن کھڑکی میں ایک تصویر کو دلچسپی کے ساتھ دیکھنے کے لئے رکے جس میں ایک خوبصورت عورت جوتا اتارتے ہوئے دکھائی گئی تھی۔ اس عمل میں اس کی بہت ہی سڈول ٹانگ پوری کی پوری کھل گئی تھی اور اس کے پیچھے ایک اور کمرے کے دروازے میں سے ایک گل میچھوں اور نوکیلی داڑھی والا آدمی اسے تاک رہا تھا۔ اکاکی اکیٹیوچ نے سر ہلایا اور مسکرائے، پھر آگے بڑھ گئے۔ شاید وہ اس لئے مسکرائے تھے کہ انہوں نے کچھ بالکل ہی نامانوس چیز دیکھ لی تھی لیکن ایسی جسے ہر شخص فطری طور پر محسوس کرتا ہے۔ یا شاید وہ سوچ رہے تھے، جیسے کہ ان کی جگہ پر بہت سے عہدیدار سوچتے: ”یہ فرانسیسی بھی حد کرتے ہیں!.. بس کیا کہا جائے، اگر انہیں کوئی چیز چاہئے ہوتی ہے تو بس پھر وہی چیز...“ لیکن ہوسکتا ہے انہوں نے یہ بھی نہ سوچا ہو۔ آخر آپ کسی دوسرے آدمی کے دماغ کے اندر تو نہیں

جہانک سکتے اور نہ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔
 آخر کار وہ اس عمارت تک پہنچ گئے جس میں اسسٹنٹ ہیڈ کلرک نے
 کرائے پر ایک فلیٹ لے رکھا تھا۔ اسسٹنٹ ہیڈ کلرک شان سے رہتا
 تھا۔ سیڑھیوں پر ایک لیمپ جل رہا تھا جو دوسری منزل کے فلیٹ
 تک جاتی تھیں۔ ڈیوڑھی میں داخل ہو کر اکاکی اکیٹیوچ نے ربر
 کے جفت پوشوں کی پوری قطار دیکھی۔ ان کے بیچ میں کمرے
 کے بیچوں بیچ ایک سماوار رکھا تھا جو سنسنہا رہا تھا اور بھاپ
 کے سرغولے نکال رہا تھا۔ دیواروں پر بہت سارے اوور کوٹ اور
 لبادے لٹکے ہوئے تھے جن میں کچھ میں سمور کے کالر یا سخمیل
 کے لیبل بھی لگے تھے۔ دیوار کے ادھر سے وہ آوازوں کا شور
 سن رہے تھے۔ جیسے ہی دروازہ کھلا اور ایک خدمتگار خالی پیالیوں،
 کریم کے جگ اور بسکٹوں کی ٹوکری سمیت ایک بڑے بڑے ٹرے لئے ہوئے
 داخل ہوا تو وہ آوازیں صاف اور زیادہ زوردار ہو گئیں۔ صاف ظاہر
 تھا کہ عہدیداران کافی دیر پہلے جمع ہو چکے تھے اور پہلی پیالی
 چائے پی چکے تھے۔ اکاکی اکیٹیوچ اپنا اوور کوٹ خود ٹانگ کر
 کمرے میں داخل ہوئے اور شمعوں، عہدیداروں، پائپوں اور تاش
 کھیلنے کی میزوں کا جمگھٹ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ چاروں طرف
 باتیں کرنے والوں کی آوازوں اور کرسیاں کھسکانے کے شور سے ان کے
 کان بجنے لگے۔ وہ بوکھلائے ہوئے سے کمرے کے بیچ میں کھڑے
 تھے، ادھر ادھر دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے کہ کیا کریں۔ لیکن
 لوگوں نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ خوش آمدید کے شور کے ساتھ ان کا
 خیر مقدم کیا گیا اور پھر ایک عام بھگدڑ مچی ڈیوڑھی میں ان کا
 اوور کوٹ دیکھنے کے لئے۔ اکاکی اکیٹیوچ ذرا جھینپے لیکن وہ
 بھولے بھالے آدمی تھے اس لئے جب ان کے اوور کوٹ کی تعریف کی گئی
 تو انہیں بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ سب لوگ
 انہیں اور ان کے اوور کوٹ کو چھوڑ کر، جیسا کہ توقع کی جانی
 چاہئے، اپنی اپنی میزوں کے پاس چلے گئے جو تاش کھیلنے کے لئے
 لگائی گئی تھیں۔ شور، باتیں، اتنے بہت سے لوگ۔ یہ سب اکاکی
 اکیٹیوچ کے لئے بالکل انوکھا تھا۔ ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا
 کہ وہ کیا کریں، ہاتھ کہاں رکھیں، پاؤں کو کدھر لے جائیں اور
 بیشہ کہ کھڑے رہیں۔ بالآخر وہ بھی ایک میز کے پاس چلے

گئے، تاشوں کو دیکھنے لگے، کھیلنے والوں کے چہروں کو تکتے رہے اور تھوڑی دیر کے بعد جماہیاں لینے لگے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ سب تو خاصا بے کیف تھا اور ان کا سونے کا وقت تو کب کا ہو چکا تھا۔ انہوں نے سیزبان سے رخصت لینی چاہی لیکن دوسروں نے انہیں اٹھنے ہی نہ دیا اور احتجاج کیا کہ انہیں تو نئی خریداری کا جشن منانے کے لئے ایک گلاس شامپین ضرور ہی پینی ہے۔ ایک گھنٹے بعد کھانا چنا گیا۔ کئی طرح کے سالاد، ٹھنڈا گوشت، پاتے، پیسٹریاں اور شامپین۔ اکاکی اکاکیٹیوچ کو دو گلاس پلائے گئے جس کے بعد انہیں لگنے لگا کہ کمرے میں زیادہ خوشی کا ماحول ہے۔ البتہ یہ بات وہ نہیں بھولے تھے کہ بارہ بج چکے تھے اور ان کے لئے گھر جانے کا وقت بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اس خیال سے کہ سیزبان کہیں انہیں اور روکنے کی کوشش نہ کریں وہ چپکے سے کمرے سے کھسک آئے، انہوں نے اپنا اوور کوٹ تلاش کیا جسے فرش پر پڑا دیکھ کر انہیں بڑا دکھ ہوا۔ اسے اٹھا کر انہوں نے جھاڑا، اس پر سے روئیں وغیرہ چنے اور اسے پہن کر سیڑھی سے اتر کر سڑک پر آ گئے۔

باہر ابھی تک اجالا تھا۔ چند چھوٹی چھوٹی دکانیں ابھی تک کھلی تھیں جنہیں نوکر چاکر ہمیشہ کلب کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ دوسری دکانیں بند ہو چکی تھیں لیکن ان کی درزوں میں سے بھی روشنی کی لمبی روپہلی لکیریں نکل رہی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی بالکل اجاڑ نہیں ہوئیں اور ان میں شاید خادمائیں یا نوکر ہوں گے جو شام کی گپ بازی میں مصروف ہیں جبکہ ان کے مالک اور مالکین ان کے بارے میں حیران ہو رہے ہوں گے کہ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئے۔ اکاکی اکاکیٹیوچ خوش دلی کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ تو وہ دوڑنے سے بھی لگے بغیر کسی خاص سبب کے، بس ایک خاتون کے تعاقب میں جو ان کے پاس سے جسم کے ہر حصے سے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتی ہوئی بجلی کے کوندے کی طرح نکل گئی تھیں۔ لیکن وہ جلد ہی رک گئے اور اپنی سابق سبک رفتاری سے چلنے لگے اور اپنی اس غیر متوقع تیزی پر خود حیران رہ گئے۔ جلد ہی وہ ان اجاڑ گلیوں میں پہنچ گئے جن میں رات کا تو ذکر ہی کیا دن کو بھی اتنا سناٹا ہوتا ہے کہ ان میں سے گزرنے کا جی

نہیں چاہتا۔ اس وقت تو وہ اور بھی سنسان اور ویران تھیں۔ گلیوں میں بتیاں بہت ہی دور دور پر تھیں، یہاں ظاہر ہے کہ تیل کی کمی تھی۔ اینٹوں اور لوہے سے زیادہ لکڑی کے گھر اور باڑھیں تھیں، نہ آدم نہ آدم زاد، بس گلی میں دمکتی ہوئی برف سے روشنی نکلتی تھی اور نیچی نیچی جھونپڑیاں اپنے اندھیرے پٹوں کی آڑ میں اداس اداس سی سو رہی تھیں۔ اب تک میں وہ اس جگہ کے پاس پہنچ گئے تھے جہاں گلی ایک بہت بڑے چوک میں، ایک بھیانک، خالی ویرانے میں پہنچ جاتی تھی جس کے دوسرے سرے پر عمارتیں بہت مدہم مدہم سی نظر آتی تھیں۔

بہت دور پر ایک دربان کے کھوکھے کا لیمپ جلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کے اس سرے پر ہے۔ اس مقام پر اکاکی اکاکیوچ کی خوش دلی میں بڑی کمی آگئی۔ وہ چوک میں سے ایک انجانے خوف کے ساتھ گزرنے لگے جیسے انہیں اندازہ ہو گیا ہو کہ کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ انہوں نے پیچھے سڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے وہ سمندر میں ہوں۔ انہوں نے سوچا ”نہیں، نہ دیکھنا ہی اچھا ہے“ اور آنکھیں بند کر کے آگے بڑھنے لگے اور جب یہ دیکھنے کے لئے انہوں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں کہ چوک کے ختم ہونے میں ابھی کتنا فاصلہ ہے تو اچانک انہوں نے دیکھا کہ عین ان کی ناک کے سامنے کچھ سونچھوں والے لوگ کھڑے ہیں حالانکہ یہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور ان کا دل بڑے زوروں میں دھڑکنے لگا۔

”لیکن یہ اوور کوٹ تو میرا ہے!“ ان میں سے ایک نے دھمکانے والی آواز میں کہا اور ان کا کالر پکڑ لیا۔

اکاکی اکاکیوچ مدد کے لئے پکار لگانے ہی والے تھے کہ دوسرے نے اپنا مکا، جو کسی سرکاری عہدیدار کے سر کے برابر تھا، ان کے منہ پر جڑ دیا اور غرایا ”ذرا تو چیخ کے دیکھا!“ اس کے بعد اکاکی اکاکیوچ کو صرف یہ یاد تھا کہ ان لوگوں نے ان کا اوور کوٹ اتارا، ان کے پیٹ پر گھٹنے سے کس کے مارا اور وہ پیٹھ کے بل برف پر گر پڑے اور پھر انہیں کچھ پتہ نہیں۔ چند منٹ بعد انہیں ہوش آیا تو وہ کھڑے ہوئے لیکن اس وقت وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

انہیں کھلے میں سردی لگی اور احساس ہوا کہ اوور کوٹ غائب ہے تو انہوں نے چلانا شروع کیا لیکن ان کی آواز شاید چوک کے سرے تک پہنچ ہی نہیں پارہی تھی۔ انتہائی مایوسی میں چلاتے ہوئے وہ چوک کو پار کر کے کھوکھے کی طرف دوڑے۔ اس کھوکھے کے پاس ہی گشت والا کانسٹیبل اپنے تبر کو ٹیکے ہوئے کھڑا تھا۔ وہ اکاکی اکاکیٹیوچ کو حیرت سے تک رہا تھا کہ یہ کون بھوت اس کی طرف دور سے دوڑتا ہوا آرہا ہے اور چلا رہا تھا۔ اکاکی اکاکیٹیوچ جب اس کے پاس پہنچے تو ہانپتے ہوئے اس پر چیخنے لگے کہ وہ سوتا رہتا ہے اور کچھ بھی ہوجائے دیکھتا نہیں، دیکھتا رہتا ہے اور لوگوں کو لوٹ لیا جاتا ہے۔ گشت والے کانسٹیبل نے جواب دیا کہ اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا، بس یہ دیکھا کہ ان کو دو آدمیوں نے بیچ چوک میں روکا لیکن اس نے یہ سوچا کہ ان کے دوست ہوں گے اور اس کے اوپر چلانے میں اپنا وقت خراب کرنے کی بجائے کل انہیں سارجنٹ کے پاس جانا چاہئے اور وہ پتہ چلا لے گا کہ کس نے انہیں لوٹا ہے۔ اکاکی اکاکیٹیوچ بہت ہی خراب حال میں بھاگتے ہوئے گھر پہنچے۔ ان کے بال جو ابھی تک چھوٹے گچھوں میں ان کی کنپٹیوں اور گدی پر باقی تھے بالکل بکھرے ہوئے تھے، ان کے پہلو، سینے اور پتلون پر برف جمی ہوئی تھی۔ ان کی بڑھیا مکان مالکن دروازے پر بڑی ڈراؤنی دستک سن کر بستر سے ہڑبڑا کر اٹھی اور صرف ایک سلیپر اٹکا کر دروازہ کھولنے دوڑی۔ وہ اپنی شمیز کی آستین سے بڑی حیا کے ساتھ اپنا سینہ ڈھکے ہوئے تھی۔ دروازہ کھول کر اس نے جو اکاکی اکاکیٹیوچ کو اس حال میں دیکھا تو سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ جب انہوں نے بتایا کہ معاملہ کیا ہے تو اس نے ہاتھ پھیلا کر اعلان کیا کہ انہیں سیدھے انسپکٹر کے پاس جانا چاہئے، سارجنٹ تو ضرور دھوکا دے گا، وعدہ کر کے الو بنائے گا، بہتر یہی ہوگا کہ وہ سیدھے انسپکٹر کے پاس جائیں جو اس کی جان پہچان کا بھی ہے اس لئے کہ جو فن لینڈی لڑکی آنا اس کے ہاں باورچن کا کام کرتی تھی وہی اب انسپکٹر کے بچوں کی کھلائی ہے اور انسپکٹر تو روز یہیں اس کے گھر کے پاس سے گزرتا ہے اور اتوار کو وہ گرجے بھی جاتا ہے، عبادت کرتا ہے اور سب کو مسکرا مسکرا کر دیکھتا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ

ضرور نیک آدمی ہوگا۔ یہ مشورہ سن کر اکاکی اکاکیوچ اداسی سے سر جھکائے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ رات انہوں نے کس طرح بسر کی اس کو ہم ان لوگوں کے تخیل پر چھوڑتے ہیں جو خود کو دوسروں کی حالت میں تصور کر سکتے ہیں۔

صبح سویرے ہی وہ انسپکٹر سے ملنے کے لئے گئے لیکن وہاں انہیں خبر دی گئی کہ انسپکٹر صاحب ابھی سو رہے ہیں، دس بجے وہ دوبارہ گئے تو پھر انہیں بتایا گیا کہ ابھی وہ نہیں اٹھے اور جب اکاکی اکاکیوچ تیسری مرتبہ گیارہ بجے آئے تو معلوم ہوا کہ انسپکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ وہ دن کے کھانے کے وقت پھر آئے لیکن سامنے کے کمرے میں جو کلرک بیٹھے تھے انہوں نے اکاکی اکاکیوچ کو کسی طرح اندر نہیں جانے دیا اور کہا کہ پہلے وہ بتائیں کہ انہیں کیا کام ہے، کیا ضرورت ہے اور کیا ہوا ہے۔ اس پر اکاکی اکاکیوچ نے کردار کی پختگی دکھانے کا فیصلہ کیا اور سختی کے ساتھ کہا کہ انہیں خود انسپکٹر سے ملنا ہے، کہ وہ لوگ انہیں روکنے کی ہمت نہیں کر سکتے، کہ وہ سرکاری کام سے اپنے محکمے سے آئے ہیں اور اگر انہوں نے ان لوگوں کی شکایت کر دی تب انہیں پتہ چلے گا۔ اس کے جواب میں کلرکوں کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی اور ان میں سے ایک اٹھ کر انسپکٹر کو بلانے گیا۔ لیکن انسپکٹر نے اوور کوٹ کے چھین لئے جانے کے قصے کو بہت ہی عجیب طریقے سے سنا۔ معاملے کے خاص نقطے کی طرف توجہ کرنے کی بجائے اس نے الٹے اکاکی اکاکیوچ سے سوالات کرنے شروع کر دیے کہ وہ اتنی دیر سے کیوں گھر واپس آ رہے تھے اور وہ کسی ایسی ویسی جگہ تو نہیں گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکاکی اکاکیوچ بالکل ہی گڑبڑا گئے اور اس کے پاس سے چلے آئے بغیر یہ جانے ہوئے کہ اوور کوٹ والے معاملے کی تفتیش کی جائے گی یا نہیں۔ اس دن وہ اپنے محکمے سے دن بھر غیر حاضر رہے (یہ ان کی زندگی میں پہلا ایسا اتفاق تھا)۔ اگلے دن وہ بالکل زرد اور اپنے پرانے اوور آل میں اپنے محکمے گئے۔ وہ اوور آل اب اور بھی بوسیدہ لگنے لگا تھا۔ اس ڈکیتی کا قصہ سن کر بعض عہدیداروں کو تو اکاکی اکاکیوچ پر اس وقت بھی ہنسنے میں کوئی تکلف نہیں ہوا لیکن زیادہ تر لوگوں کو بڑا رنج ہوا۔ فیصلہ کیا گیا کہ ان کے لئے اسی وقت چندہ کیا جائے لیکن

بہت تھوڑی رقم جمع ہوئی اس لئے کہ اس سے پہلے ہی عہدیداروں کو کافی رقم نکالنی پڑی تھی پہلے تو ڈائریکٹر کی تصویر بنوانے کے لئے اور پھر کوئی کتاب خریدنے کے لئے جس کی سفارش ان کے محکمے کے سربراہ نے کی تھی اس لئے کہ کتاب کا مصنف ان کا دوست تھا۔ تو یوں رقم بہت تھوڑی جمع ہوئی۔ ان میں سے ایک نے ہمدردی کے جوش میں اکاکی اکاکیٹیوچ کی مدد کرنے کے لئے کم سے کم مفید مشورہ ہی دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اکاکی اکاکیٹیوچ سے کہا کہ وہ پولیس سارجنٹ کے پاس نہ جائیں اس لئے کہ سارجنٹ اپنے افسران بالا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہو سکتا ہے کہ اوور کوٹ کو کسی نہ کسی طرح تلاش کر لے لیکن جب تک اکاکی اکاکیٹیوچ اس بات کا قانونی ثبوت نہ فراہم کریں کہ وہ اوور کوٹ ان کا ہے تب تک وہ پولیس ہی کے قبضے میں رہے گا۔ سب سے اچھا یہ ہے کہ وہ ایک ”بڑے آدمی“ کے پاس جائیں اور یہ ”بڑا آدمی“ مناسب لوگوں کے پاس پرچے اور سیمورنڈم بھیج کر معاملے کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھا سکتا ہے۔ اکاکی اکاکیٹیوچ اور کرتے ہی کیا، وہ اس ”بڑے آدمی“ کے پاس گئے۔

”بڑے آدمی“ کا عہدہ کیا تھا یہ تو آج تک نہیں معلوم ہو سکا۔ بس اتنا جاننا کافی ہے کہ یہ ”بڑے آدمی“ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ”بڑے آدمی“ بنے تھے اور اس سے پہلے معمولی آدمی تھے۔ مزید برآں یہ کہ ان کے نئے عہدے کو دوسرے اور بھی زیادہ بڑے آدمیوں کے عہدوں کے مقابلے میں کوئی خاص اہم نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن خیر ایسے لوگ تو آپ کو ہمیشہ مل جائیں گے جن کی نظروں میں وہی اہم ہوتا ہے جو دوسروں کی نظروں میں اہم نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ بڑے آدمی اپنی اہمیت کو ہر طرح سے بڑھانے کے جتن کرتے رہتے تھے۔ مثلاً انہوں نے حکم دے دیا کہ جب وہ کام پر آئیں تو سارے ماتحت عہدیدار سیڑھی پر ان کا خیر مقدم کریں، کہ کوئی بھی سیدھے ان کے پاس نہ آئے بلکہ مندرجہ ذیل مراتب کی پابندی سختی کے ساتھ کی جائے۔ کالیجیٹ رجسٹرار رپورٹ کرے صوبائی سکرٹری کو، صوبائی سکرٹری خطابہ کونسلر کو یا جو بھی اس کا افسر بالا ہو اور اس طرح معاملہ بالآخر ان تک پہنچ جائے گا۔ مقدس روس کی اب یہی حالت ہو گئی ہے کہ

نقالی کا مرض ہر ایک کو لگ گیا ہے، سبھی اپنے افسر اعلیٰ کی نقل کرتے ہیں۔ کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ ایک خطابی کونسلر کو جیسے ہی کسی چھوٹے سے دفتر کے ایک محکمے کا افسر بنایا گیا ویسے ہی اس نے پارٹیشن لگا کر اپنے لئے ایک الگ کمرہ بنالیا اور اسے ”صدر دفتر“ کہنے لگا اور باہر لال کالر اور سنہری گوٹ والے چیراسی بٹھا دئے جو ہر آنے والے کے لئے اٹھ کر دروازہ کھولتے حالانکہ ”صدر دفتر“ بس اتنا بڑا تھا کہ اس میں ایک معمولی سی میز بھی مشکل سے آتی۔ ”بڑے آدمی“ کی عادتیں اور طور طریق خاصے شاندار اور رعبدار تھے لیکن کسی طرح بھی پیچیدہ نہیں تھے۔ ان کے نظام کی خاص بنیاد تھی سختی، وہ کہا کرتے تھے ”سختی، سختی اور — سختی“، اور آخری لفظ کہہ کر وہ بڑے معنی خیز انداز میں اپنے مخاطب کو دیکھا کرتے تھے۔ حالانکہ درحقیقت اس کی کوئی وجہ نہ تھی اس لئے کہ جن درجن بھر عہدیداروں پر اس محکمے کا پورا انتظامی میکانزم مشتمل تھا وہ سب اس کے بغیر ہی بے حد سہمے رہتے تھے۔ جب وہ اپنے افسر اعلیٰ کو آتے دیکھتے تو سب کے سب کام چھوڑ کر بادب کھڑے ہو جاتے جب تک وہ کمرے میں سے گزر نہ جاتے۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ ان کی بات چیت میں بڑی سختی ہوتی تھی اور عام طور سے تین فقروں پر مشتمل ہوتی تھی: ”تم نے یہ ہمت کیسے کی؟.. تمہیں پتہ ہے کہ تم کس سے بات کر رہے ہو؟ جانتے ہو تم کہ تمہارے سامنے کون کھڑا ہے؟..“

اس سب کے باوجود وہ نیک آدمی تھے، دوستوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آتے اور لوگوں کے کام کر دیتے۔ لیکن جنرل کے رتبے پر فائز ہونے کی وجہ سے ان کا سر بالکل ہی پھر گیا تھا۔ جب سے انہیں جنرل کا رتبہ ملا تھا تبھی سے وہ کچھ گڑبڑا گئے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح برتاؤ کریں۔ جب وہ اپنے برابر والوں میں ہوتے تو اب بھی ویسے ہی ہوتے جیسے آدمی کو ہونا چاہئے، بڑے قاعدے کے آدمی اور بہت سے اعتبار سے خاصے سمجھدار آدمی بھی۔ لیکن جیسے ہی وہ ایسے لوگوں میں پہنچتے جو ان سے ایک رتبہ بھی نیچے ہوتے ویسے ہی وہ بالکل بے بس ہو جاتے تھے، چپ رہتے اور ان کی حالت پر رحم بھی آتا اس لئے اور بھی کہ وہ

خود ہی محسوس کرتے تھے کہ وہ زیادہ اچھی طرح وقت گزار سکتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی آنکھوں سے صاف یہ زبردست خواہش ظاہر ہوتی کہ وہ کسی دلچسپ بات چیت میں یا کسی حلقے میں شامل ہونا چاہتے ہیں لیکن یہ خیال ان کو روک دیتا ہے کہ کیا یہ ان کی طرف سے بہت زیادہ جھکنا نہیں ہوگا، کیا یہ لوگوں کو بہت منہ لگانا نہیں ہوگا اور کیا اس طرح وہ اہمیت نہیں گنوا بیٹھیں گے؟ اس طرح کی دلیلوں کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ دیر دیر تک اسی خاموشی کی حالت میں رہتے اور کبھی کبھار بس ہوں ہاں کر دیتے۔ اس طرح لوگ انہیں بے کیف آدمی کہنے اور سمجھنے لگے۔ یہ تھے وہ ”بڑے آدمی“، جن کے پاس اکاکی اکائیوچ آئے اور اس کے لئے انہوں نے اپنی بدقسمتی لیکن ”بڑے آدمی“ کی خوش قسمتی سے بہت ہی ناسازگار وقت کا انتخاب کیا۔ ”بڑے آدمی“ اپنے کمرے میں بیٹھے بہت ہی خوش دلی کے ساتھ ایک پرانے واقف کار اور بچپن کے دوست کے ساتھ باتیں کر رہے تھے جو ابھی حال ہی میں دارالسلطنت آئے تھے اور جن سے وہ کئی برس کے بعد ملے تھے۔ اسی عرصے میں انہیں اطلاع دی گئی کہ بشماچکین ناسی ایک شخص ان سے ملنے آئے ہیں۔ انہوں نے جھڑک کر پوچھا ”کون ہے وہ؟“، جواب ملا ”کوئی عہدیدار ہیں“۔ ”اچھا، کہو انتظار کرے، ابھی وقت نہیں ہے“، انہوں نے کہہ دیا۔ اس جگہ یہ کہنا ضروری ہے کہ ”بڑے آدمی“ نے صاف جھوٹ کہا تھا۔ وقت ان کے پاس تھا، وہ اور ان کے دوست بہت پہلے ساری بات چیت کر چکے تھے اور اب بات چیت نے طویل خاموشیوں کی صورت اختیار کر لی تھی جن کے بیچ بیچ میں وہ ایک دوسرے کی جانگھ پر ہاتھ مارتے اور کہتے ”تو یوں ہے ایوان ابراسوچ!“، ”بس یوں ہے استہان وراسوچ!“، پھر بھی انہوں نے عہدیدار کو انتظار کرنے کا حکم دیا تاکہ اپنے دوست کو، جو کافی دنوں سے پنشن لے کر اپنے دیہات کے گھر میں رہنے لگے تھے، یہ دکھا دیں کہ عہدیداروں کو ان سے ملنے کے لئے سامنے کے کمرے میں کتنی کتنی دیر انتظار کرنا پڑتا تھا۔ آخر کار جب وہ جی بھر کر باتیں کر چکے اور بھی جی بھر کر چپ رہ چکے اور اپنی اپنی آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر سگار پینا بھی ختم کر چکے تو انہوں نے سکرٹری سے، جو ہاتھ میں کوئی کاغذ لئے کچھ اطلاع دینے کے لئے دروازے

پر کھڑا تھا کہا: ”ارے ہاں، وہ کوئی عہدیدار بیٹھا ہے نہ؟ اس سے کہو کہ آسکتا ہے۔“ اکاکی اکاکیٹیوچ کی خستہ حالت اور بوسیدہ وردی کو دیکھ کر ”بڑے آدمی“، اچانک ان کی طرف مڑے اور ”کیا کام ہے؟“ اس جھڑکنے کی سی سخت آواز میں بولے جس کی مشق انہوں نے موجودہ عہدہ اور جنرل کا رتبہ ملنے سے ہفتہ بھر پہلے سے بند کمرے میں اکیلے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خوب اچھی طرح کر لی تھی۔

اکاکی اکاکیٹیوچ پہلے ہی کافی سرعوب تھے، اب تو وہ بالکل ہی سٹپٹا گئے اور جہاں تک ان کی گھگھی سی بندہ جانے والی حالت نے اجازت دی اپنے معمول سے زیادہ ”وہ یوں سمجھئے...“ کے ساتھ انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس یہ نیا اوور کوٹ تھا اور انہیں بہت ہی وحشیانہ طریقے سے لوٹ لیا گیا اور اب وہ عالیمرتبہ کے پاس آئے ہیں کہ وہ اپنے طور پر جناب چیف انسپکٹر پولیس صاحب بہادر یا کسی اور سے کہہ کر ان کا اوور کوٹ حاصل کروا دیں۔ پتہ نہیں کیوں جنرل کو یہ برتاؤ کچھ بہت زیادہ بے تکلفی کا سا لگا اور انہوں نے اسی تندی کے ساتھ کہا:

”تو جناب کو کیا مناسب طریقہ معلوم نہیں ہے؟ یہ آپ کہاں آگئے؟ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے؟ اس کے لئے پہلے آپ کو دفتر میں عرضی دینی چاہئے تھی جو ہیڈ کلرک کے پاس جاتی، پھر محکمے کے اعلیٰ افسر کو، پھر وہ سکرٹری کو دی جاتی اور سکرٹری اسے میرے پاس لاتا...“

”لیکن عالیمرتبہ“، اکاکی اکاکیٹیوچ نے اپنی ساری ہمت کو مجتمع کر کے اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ انہیں پسینے چھوٹ رہے ہیں کہا ”میں نے عالیمرتبہ کو زحمت دینے کی جرأت اس لئے کی کہ سکرٹری تو وہ یوں سمجھئے کہ... ناقابل اعتبار لوگ ہوتے ہیں...“

”بڑے آدمی“، نے ٹوکا: ”کیا، کیا، کیا؟ آپ کو یہ کہنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ آپ کو یہ خیال کیسے ہوا؟ کیا حال ہو گیا ہے نوجوان پیڑھی کا جو اپنے افسروں اور بڑوں کے ساتھ اس قدر باغیانہ گستاخی کے ساتھ پیش آتے ہیں!“

”بڑے آدمی“ نے غالباً اس طرف دھیان نہیں دیا تھا کہ اکاکی اکاکیٹیوچ پچاس سے اوپر کے ہو چکے تھے۔ یا وہ انہیں اضافی معنوں

میں یعنی کسی ایسے شخص کے مقابلے میں نوجوان پیڑھی کا کہہ رہے تھے جو ستر کا ہو چکا ہے۔ ”آپ کو پتہ ہے کہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ آپ کے سامنے کون کھڑا ہے، سن رہے ہیں آپ میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

اور انہوں نے زور سے اپنا پاؤں ٹپکا اور اپنی آواز اتنی اونچی کر دی کہ اکاکی اکاکیٹوچ ہی نہیں کوئی بھی ہوتا تو ڈر جاتا۔

اکاکی اکاکیٹوچ تو ڈر کے مارے بالکل مفلوج ہو گئے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹے، ان کا سارا بدن کانپ اٹھا، ان سے کسی طرح کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا اور اگر دو چپراسیوں نے دوڑ کر انہیں پکڑ نہ لیا ہوتا تو وہ فرش پر گر جاتے۔ انہیں تقریباً بیہوشی کی حالت میں باہر لے جایا گیا۔ بڑے آدمی کو اپنے الفاظ کا اثر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ یہ اثر ان کی توقع سے بھی زیادہ تھا اور وہ اس خیال سے بالکل مست ہو رہے تھے کہ ان کے الفاظ ہی سے لوگوں کے حواس گم ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے کنکھیوں سے اپنے دوست کو دیکھا کہ وہ اس کو کس طرح دیکھتے ہیں اور انہوں نے طمانیت کے ساتھ محسوس کیا کہ ان کے دوست کچھ غیر یقینی حالت میں تھے اور خود بھی کچھ خوف سا محسوس کرنے لگے تھے۔

اکاکی اکاکیٹوچ کو بالکل یاد نہیں کہ وہ سیڑھیوں سے کیسے اترے، سڑک پر کیسے پہنچے۔ انہیں اپنے ہاتھ پاؤں کی کچھ خبر نہ تھی۔ ساری زندگی انہیں کبھی کسی جنرل نے یوں نہ ڈانٹا تھا اور وہ بھی دوسرے محکمے کے جنرل نے۔ وہ فٹ پاتھ پر چل رہے تھے لیکن بار بار سڑک پر آجاتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح وہ منہ کھولے اس برفانی جھکڑ میں سے گزر رہے تھے جو سڑک پر سیٹیاں بجا رہا تھا۔ جیسا کہ پیٹرس برگ میں عام طور سے ہوتا ہے، ہوا چاروں طرف سے انہیں جھنجھوڑ رہی تھی، ہر طرف سے، ہر سڑک اور ہر گلی سے جھکڑ چلے آ رہے تھے۔ فوراً ہی ان کا گلا پکڑ گیا اور جب وہ گھر پہنچے تو ان سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔ اس کا سارا بدن سوچ گیا تھا اور وہ بستر سے لگ گئے۔ کبھی کبھی شدید ڈانٹ کا اثر اتنا زبردست ہوتا ہے!

اگلے دن انہیں بہت تیز بخار ہو گیا اور بھلا ہو پیٹرس برگ

کی آب و ہوا کی شاندار امداد کا کہ مرض توقع سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ گیا۔ آخر کار جب ڈاکٹر آیا اور اس نے ان کی نبض دیکھی تو ان کے لئے ایک پولٹس تو تجویز کر دی تاکہ مریض دوا کے فوائد سے محروم نہ رہ جائے لیکن اس کے بعد ہی اس نے اعلان کر دیا کہ یہ بس ڈیڑھ دن میں ختم ہو جائیں گے اور مکان مالکن کی طرف مڑ کر کہا:

”لیکن ماں جی، آپ بیکار وقت نہ ضائع کیجئے، ان کے لئے ابھی سے چیڑ کا تابوت بنوانے کے لئے کہہ دیجئے اس لئے کہ بلوط کا تو ان کے لئے بہت مہنگا ہوگا۔“

اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ اکاکی اکاکیٹوچ نے اپنے لئے یہ مہلک الفاظ سننے یا نہیں اور اگر سنے تو ان پر ان کا کیا اثر ہوا اور انہیں اپنی اس بدبخت زندگی سے محروم ہونے کا کوئی اثر ہوا یا نہیں اس لئے کہ وہ سارے وقت تیز بخار اور ہڈیان میں مبتلا رہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک عجیب و غریب مظاہر انہیں نظر آتے رہے۔ وہ پترووچ کو دیکھتے اور اسے ایک نیا اوور کوٹ بنانے کا آرڈر دیتے جس میں چوروں کے لئے خاص جال لگے ہوں، جو انہیں پلنگ کے نیچے نظر آتے رہے اور بار بار وہ مکان مالکن کو آواز دیتے کہ اس چور کو بھگاؤ جو ان کے بستر کے نیچے بھی گھس گیا ہے، یا وہ بوچھتے کہ اب جب ان کے پاس نیا اوور کوٹ ہے تو یہ ان کا پرانا اوور آل کیوں ان کے سامنے ٹنگا ہوا ہے، یا یہ کہ وہ جنرل کے سامنے کھڑے ہوئے اس کی ڈانٹ کھا رہے ہیں اور بڑبڑا رہے ہیں ”غلطی ہوئی عالیمرتب!“، اور آخر کار انہوں نے گندی اور ایسی بری گالیوں کی وہ بوچھار کی کہ ان کی مکان مالکن نے اپنے سینے پر صلیب کے نشان بنائے۔ انہوں نے ساری زندگی اکاکی اکاکیٹوچ کو کبھی ایسی باتیں کہتے نہ سنی تھیں اور اس لئے اور بھی کہ ان الفاظ سے پہلے وہ ”عالیمرتب“، ضرور کہتے تھے۔ بعد کو وہ ہڈیان بکنے لگے جو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس یہ بالکل صاف تھا کہ ان کی گڈمڈ باتیں اور خیالات سب اس شامت کے مارے اوور کوٹ پر مرکوز تھے۔ آخر کار پیچارے اکاکی اکاکیٹوچ نے دم توڑ دیا۔

لوگوں نے ان کے کمرے یا ان کی چیزوں کو سہر لگانے کی

زحمت نہیں کی، اول تو اس لئے کہ کوئی وارث تھے ہی نہیں اور
 دوسرے اس لئے کہ انہوں نے ترکہ بہت ہی تھوڑا چھوڑا تھا یعنی
 ہنس کے پروں کا ایک گچھا، ایک دستہ سفید دفتری کاغذ، تین جوڑ
 سوزے، دو یا تین بٹن جو ان کی پتلون سے نکل گئے تھے اور وہ پرانا
 اوور آل جس سے قارئین اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ سب کس کو ملا،
 خدا ہی جانے۔ اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس سے موجودہ افسانے
 کے راقم نے بھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ان کی لاش لیجائی گئی
 اور انہیں دفن کر دیا گیا۔ اور پیٹرس برگ کی زندگی اکاکی کیٹیوچ
 کے بغیر بھی یوں چلتی رہی جیسے ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ اس
 مخلوق کا نام و نشان بھی نہ رہ گیا جس کی مدافعت کرنے والا کوئی
 نہ تھا، جو کسی کو عزیز نہ تھا۔ کسی کو اس سے دلچسپی
 نہیں تھی۔ اس کی طرف تو کسی فطرت دوست نے بھی کوئی توجہ نہ
 کی جو عام گھریلو مکھی کو بھی پکڑ کر پن کے اوپر لگا کر
 خردبین سے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے
 دیتا۔ اس مخلوق نے اپنے ساتھ کلرکوں کے مذاق کو انکسار کے
 ساتھ برداشت کیا تھا اور بغیر کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دئے
 ہوئے مر گیا تھا لیکن اس کی بدبخت زندگی اپنے انجام سے ذرا دیر پہلے
 اس تابناک بشارت سے ایک لمحے کے لئے روشن ہو گئی تھی جو اسے
 نئے اوور کوٹ کی صورت میں ملی تھی، لیکن جسے بدنصیبی کے ایک
 ناقابل برداشت وار نے برباد کر دیا جو اتنا ہی تباہ کن تھا جتنا کہ
 اس دنیا کے حاکموں اور فرمانرواؤں کو بھگتنا پڑتا ہے... ان کی
 موت کے چند دنوں بعد ان کے محکمے کے چوکیدار کو اس ہدایت
 کے ساتھ ان کے فلیٹ پر بھیجا گیا کہ وہ اسی وقت کام پر حاضر
 ہو جائیں: یہ ڈائریکٹر کا حکم تھا۔ لیکن چوکیدار کو مجبوراً
 ان کے بغیر ہی واپس آنا پڑا۔ اس نے اطلاع دی کہ اب وہ کام
 پر نہیں آئیں گے اور جب اس سے پوچھا گیا کہ ”کیوں؟“، تو
 اس نے جواب دیا کہ ”بات یہ ہے کہ وہ مر گئے اور آج چوتھا دن ہے
 کہ انہیں دفن کر دیا گیا،“۔ یوں محکمے میں لوگوں کو اکاکی
 کیٹیوچ کی موت کی خبر ملی اور اگلے ہی دن ان کی جگہ پر دوسرا
 کلرک بیٹھا تھا جس کا قد کافی لمبا تھا اور جس کا خط ویسے سیدھے
 حروف والا نہیں بلکہ جھکا ہوا اور کافی ترچھا تھا۔

لیکن بھلا کون تصور کر سکتا ہے کہ اکاکی اکاکیٹیوچ کا قصہ یہاں تمام نہیں ہوا، کہ ان کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ وہ اپنی موت کے بعد کچھ دن پرشور طریقے سے اور جئیں، جیسے یہ ان کی لاحاصل زندگی کا انعام تھا؟ لیکن ہوا یہ کہ ہماری غمگین کہانی کا انجام بہت ہی غیرمتوقع طور پر بڑا محیرالعقول ہوا۔ پیٹرس برگ میں اچانک یہ افواہ پھیلنی شروع ہوئی کہ کالینکن پل کے پاس اور اس سے بہت دور آگے تک رات کو ایک بھوت دیکھا جاتا ہے۔ یہ بھوت ایک عہدیدار کے بھیس میں ہے جو کسی اوورکوٹ کی تلاش میں ہے جسے چرا لیا گیا تھا اور اس اوورکوٹ کے بدلے میں وہ عہدے اور خطاب کا لحاظ کئے بغیر ہر ایک کے کندھے سے اس کا اوورکوٹ جھپٹ لیتا ہے چاہے وہ بلی کی کھال اور سمور کے استروالے اوورکوٹ ہوں، روئی کی تہ والے اوورکوٹ ہوں، لومڑی یا بھالو کی کھال کے اوورکوٹ ہوں، غرض یہ کہ کسی طرح کے بھی فر یا کھال کے ہوں جنہیں لوگ اپنا تن ڈھکنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ محکمے کے ایک عہدیدار نے خود بھی بھوت کو دیکھا اور فوراً اکاکی اکاکیٹیوچ کو پہچان لیا لیکن اس سے اس کے دل پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ بھاگ کھڑا ہوا اور انہیں اچھی طرح دیکھ بھی نہیں پایا۔ اس نے بس یہ دیکھا کہ وہ انگلی کے اشارے سے اسے دھمکا رہے تھے۔ شکایتوں کا تانتا بندھ گیا کہ شہریوں کی اور صرف خطابی کونسروں نہیں بلکہ خاص شاہی کونسروں کی پیٹھوں اور کندھوں کو رات کے پالے کی شدت برداشت کرنی پڑی اس لئے کہ ان کے اوورکوٹ اس لٹیرے بھوت نے جھپٹ لئے تھے۔

پولیس نے حکم جاری کیا کہ اس بھوت کو پکڑا جائے، کسی بھی قیمت پر، زندہ یا مردہ اور اسے سخت ترین سزا دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ اور وہ اس ہدایت کی تعمیل کرنے میں تقریباً کامیاب بھی ہو گئے۔ کیرویوشکن سڑک پر ایک پولیس کانسٹیبل گشت کی ڈیوٹی پر تھا، اس نے اس مردہ مجرم کی گردن عین موقع واردات پر دبوچ لی جبکہ وہ کسی پنشن یاب موسیقار کا، جو پہلے بانسری بجاتا تھا، سستے اونی کپڑے کا اوورکوٹ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پولیس کانسٹیبل نے اس کا کالر پکڑ لیا اور اپنے دو ساتھیوں

کو مدد کے لئے پکارا۔ ان سے اس نے کہا کہ بھوت کو پکڑے رہیں اور خود اپنے بوٹ میں سے نسوار کی ڈیبا نکالی تاکہ اپنی ہر وقت ٹھنڈی یخ رہنے والی ناک میں ذرا جان ڈالے۔ لیکن نسوار غالباً اتنی تیز تھی کہ مردہ بھی اسے برداشت نہ کر سکا۔ جیسے ہی کانسٹیبل نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھایا ایک انگلی سے بند کیا اور اچھی چٹکی بھر دوسرے ہاتھ سے چڑھائی ویسے ہی مردے نے اتنی زوروں کی چھینک لی کہ اس کی پھوار سے ذرا دیر کو تینوں اندھے ہو گئے۔ جتنا وقت انہیں ہاتھ اٹھانے اور آنکھیں صاف کرنے میں لگا بس اتنے ہی میں مردے کا کہیں پتہ نہیں رہ گیا اور وہ یقین سے یہ بھی نہ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے اسے کبھی پکڑا بھی تھا یا نہیں۔ اس کے بعد سے کانسٹیبل مردوں سے اتنے ڈر گئے کہ وہ زندوں پر بھی ہاتھ ڈالتے ڈرنے لگے اور دور ہی سے چلاتے ”اے، چلتے بنو، آگے بڑھو!،“ مردہ عہدیدار کالینکن پل کے اس پار بھی نظر آنے لگا اور سارے ڈرپوک لوگوں کے دل میں ڈر بیٹھ گیا۔ لیکن ہم ”بڑے آدمی،“ کے بارے میں تو بالکل بھول ہی گئے جن کی وجہ سے دراصل ہماری اس کہانی کو سحیرالعقول موڑ ملا جو کہ ویسے بالکل سچی کہانی ہے۔ سب سے پہلے تو حق پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بتا دیں کہ اس ”بڑے آدمی،“ کو بیچارے ڈانٹ کھائے ہوئے اکاکی اکاکیٹیوچ کے چلے جانے کے بعد کچھ پچھتاوا سا ہوا۔ ان کے لئے ترس بالکل ہی مغائر جذبہ نہیں تھا۔ ان کے دل میں بہت سے نیک خیالات آتے تھے اس کے باوجود کہ ان کا رتبہ انہیں ان خیالات کا اظہار کرنے سے باز رکھتا تھا۔ ان کے جو دوست اس دن ملنے آئے تھے وہ جیسے ہی چلے گئے ویسے ہی ان کو بیچارے اکاکی اکاکیٹیوچ کا خیال آیا۔ اور اس کے بعد سے تقریباً روز ہی ان کی آنکھوں کے سامنے اکاکی اکاکیٹیوچ کا زرد چہرہ گھوم جاتا جو ان کی ڈانٹ سے بے حال ہوئے جارہے تھے۔ ان تصورات سے وہ اتنے پریشان ہوئے کہ ایک ہفتے بعد انہوں نے ایک عہدیدار کو اکاکی اکاکیٹیوچ کے پاس یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا کہ معاملہ کیا ہے اور کیا وہ کسی طرح اکاکی اکاکیٹیوچ کی مدد کر سکتے ہیں۔ اور جب ان کو یہ اطلاع دی گئی کہ اکاکی اکاکیٹیوچ تو اچانک کسی طرح کے بخار میں مبتلا ہو کر مر گئے تو ”بڑے آدمی،“ کو بڑا صدمہ پہنچا، ان کے ضمیر نے انہیں ملامت

کی اور تقریباً سارے دن پریشان سے رہے۔ کسی طرح اپنا جی بہلانے اور اس ناخوشگوار خبر کو ذہن سے نکال دینے کے خیال سے وہ شام کو اپنے ایک دوست کے ہاں چلے گئے جن کے گھر میں انہیں اچھی صحبت مل گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں تقریباً سبھی ایک ہی رتبے والے تھے اور وہ کسی طرح سے ملوث نہ تھے۔ اس سے ان کی ذہنی حالت پر بڑا اچھا اثر پڑا۔ ان کا تناؤ دور ہو گیا، بڑی اچھی طرح سے انہوں نے بات چیت کی، سب سے مہربانی کے ساتھ پیش آنے مختصر یہ کہ وہ شام سے اچھی طرح لطف اندوز ہوئے۔ کھانے کے ساتھ انہوں نے دو گلاس شامپین پی جو کہ خوش مزاجی کو بحال کرنے کا بہت ہی معروف ذریعہ ہے۔ شامپین سے ان کی طبیعت رنگ پر آگئی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ابھی گھر نہیں جائیں گے بلکہ ایک آشنا خاتون سے ملنے جائیں گے جن کا نام تھا کیرو لینا ایوانوونا۔ وہ شاید جرمن تھیں اور ان کے ساتھ ”بڑے آدمی“ کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ بڑے آدمی اب جوان نہیں رہ گئے تھے، اپنی بیوی کے لئے اچھے شوہر اور اپنے بچوں کے لئے اچھے باپ تھے۔ ان کے دو بیٹے، جن میں سے ایک سرکاری عہدیدار تھا، اور ان کی ۱۶ سالہ بیٹی، جس کی ناک ذرا چھوٹی لیکن خاصی اچھی تھی، روزانہ ان کے پاس آکر ان کے ہاتھ کو بوسہ دیتے اور کہتے ”ہاں، ہاں، ہاں، ہاں“۔ ان کی اہلیہ ابھی دم خیم والی عورت تھیں اور ایسی بری بھی نہیں تھیں۔ وہ پہلے اپنا ہاتھ شوہر کی طرف بڑھاتیں کہ وہ بوسہ دیں اور پھر الٹ کر ان کے ہاتھ کو خود بوسہ دیتیں۔ لیکن ”بڑے آدمی“، ان خانگی خاندانی شفقتوں سے پوری طرح مطمئن ہونے کے باوجود شہر کے دوسرے حصے میں کسی خاتون کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کو خلاف اخلاق نہیں سمجھتے تھے۔ یہ آشنا خاتون ان کی بیوی سے کم عمر یا زیادہ خوبصورت نہ تھیں لیکن ایسی تعجب خیز باتیں اس دنیا میں ہوتی ہی رہتی ہیں اور ان کو اچھا یا برا قرار دینا ہمارا کام نہیں ہے۔ تو ”بڑے آدمی“، سیڑھیوں سے اترے، اپنی برف گاڑی میں بیٹھے اور کوچوان سے بولے ”کیرو لینا ایوانوونا کے ہاں چلو“، اور خود کو انہوں نے اپنے گرم اوور کوٹ میں اچھی طرح لپیٹ لیا اور ذہن کی اس حالت میں پہنچ گئے جو ایک اوسط روسی کو اتنی عزیز ہوتی ہے جب اسے

سوچنا نہیں پڑتا بلکہ خیالات اپنے آپ ہی اس کے ذہن میں آتے چلے جاتے ہیں اور ہر ایک پہلے والے سے زیادہ دل خوش کن ہوتا ہے اور کسی کو گرفت میں لانے یا تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ طمانیت سے بھرے ہوئے انہوں نے شام کی دعوت کے دلچسپ واقعات کو یاد کرنا شروع کیا، ساری حاضر جوابیوں کے بارے میں سوچا جن پر ایک چھوٹے سے حلقے میں قہقہے لگتے تھے، ان میں سے بہتوں کو دبی زبان سے دوہرایا بھی اور انہوں نے دیکھا کہ وہ اس وقت بھی پہلے ہی کی طرح مضحکہ خیز لگتے تھے، چنانچہ ہمیں یہ معلوم کر کے تعجب نہ ہونا چاہئے کہ وہ خود بھی زور سے ہنس پڑے۔ لیکن ان کی خوشی کو کبھی کبھی ہوا کا کوئی جھونکا غارت کر دیتا جو خدا جانے کہاں سے اور کس لئے آجاتا تھا اور ان کے منہ پر طمانچے سے لگاتا تھا، اس پر برف کی چھریاں مارتا تھا، ان کے اوور کوٹ کے کالر کو کرمیج کے بادبان کی طرح پھٹ پھٹاتا یا اچانک ایک غیر قدرتی طاقت کے ساتھ اسے سر کے اوپر پہنچا دیتا اور انہیں خود کو چھڑانے میں سخت زحمت ہوتی۔ اچانک ”بڑے آدمی“ نے محسوس کیا کہ کسی نے ان کے کالر کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ مڑ کے جو دیکھا تو انہیں ایک پستہ قد آدمی نظر آیا، پرانی بوسیدہ وردی پہنے ہوئے۔ اور بڑے آدمی نے جب پہچانا کہ وہ اکاکی اکا کیٹیوج ہیں تو ڈر کے مارے ان کا برا حال ہو گیا۔ بوڑھے عہدیدار کا چہرہ برف کی طرح سفید تھا اور وہ بالکل لاش کی طرح لگ رہے تھے۔ لیکن بڑے آدمی کے تو اوسان خطا ہو گئے جب انہوں نے یہ دیکھا کہ مردے کا منہ اینٹھا اور اس نے قبر کی بھیانک بو نکالتے ہوئے کہا کہ ”اچھا، تو یہ تم ہو! آخر کو یہ سمجھو میں نے تمہاری گردن دبوچ ہی لی نہ! تمہارے ہی اوور کوٹ کی تو مجھے تلاش تھی! تم میری مدد نہیں کرنا چاہتے تھے نہ، اور تم نے مجھے ڈانٹ بھی بتائی، تو لاؤ اب اپنا اوور کوٹ میرے حوالے کر دو!،“

بیچارے ”بڑے آدمی“ کی تو جان ہی نکل گئی۔ محکمے میں اور بالعموم اپنے سے کم رتبے والوں کے سامنے وہ کردار کے بڑے پختہ تھے اور ان کا ڈیل ڈول اور صورت شکل بڑی مردانہ تھی جس کو دیکھ کر لوگ کہتے ”اف، کیا کردار ہے!،“ لیکن اس کے باوجود سورماؤں والی صورت شکل کے بہت سے لوگوں کی طرح وہ

بھی اس وقت ایسے ڈر گئے کہ ان کو لگا ان کا دم نکل جائے گا۔
جتنی جلدی ہو سکا انہوں نے اوور کوٹ اتار کر پھینکا اور عجیب
سی آواز میں چلا کر کوچوان سے کہا ”گھر چلو، پوری
تیزی سے!“

کوچوان نے جو یہ آواز اس لمبے میں سنی جو عام طور سے
فیصلہ کن لمحوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ
زیادہ زوردار چیزیں بھی ہوتی ہیں تو ہر بنائے احتیاط اس نے اپنا سر
جھکا کر کندھوں کی آڑ میں کر لیا، کوڑا سڑکایا اور کمان سے چھٹے
تیر کی طرح چل پڑا۔ کوئی چھ منٹ میں بڑے آدمی اپنے گھر کے
دروازے پر پہنچ گئے۔ زرد، صدمے کی حالت میں اور بغیر
اوور کوٹ کے وہ اپنے گھر ہی آگئے تھے اور انہوں نے کیرو لینا
ایوانوونا کے ہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح
وہ اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ رات انہوں نے اتنی بے چینی میں
گزاری کہ صبح کو ان کی بیٹی نے دھڑ سے کہہ دیا ”پاپا، آج آپ
بالکل زرد ہو رہے ہیں،“۔ لیکن پاپا چپ رہے اور انہوں نے ایک
لفظ بھی کسی سے نہیں کہا کہ کیا ہوا تھا، وہ کہاں گئے تھے اور
کہاں جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس واقعے کا اثر ان پر بہت ہی
گہرا ہوا۔ اب انہوں نے اپنے ماتحتوں سے یہ کہنا کم کر دیا کہ
”تمہاری ہمت کیسے پڑی۔ تم جانتے ہو کہ تم کس سے بات کر
رہے ہو؟“، اور جب کہتے بھی تو پہلے دوسرے کی بات سن لیتے کہ
اسے کیا کہنا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ قابل ذکر بات تو یہ تھی
کہ اس تاریخ کے بعد عہدیدار کا بھوت بالکل غائب ہو گیا۔ صاف
ظاہر تھا کہ اسے تو بس جنرل کا اوور کوٹ چاہئے تھا۔ بہر حال
پھر یہ قصے تو نہیں سنے گئے کہ لوگوں کی پیٹھ پر سے ان کے
اوور کوٹ جھپٹ لئے گئے ہوں۔ لیکن بہت سے سرگرم اور فکرمند
لوگ بھلا چپ کیسے رہ سکتے تھے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ عہدیدار
شہر کے دورافتادہ علاقوں میں اب بھی دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ
بالکل سچ ہے کہ کلومنا ضلع میں ایک کانسٹیبل نے ایک بھوت کو
ایک عمارت کی آڑ سے نکلتے اپنی آنکھ سے دیکھا لیکن یہ کانسٹیبل
طبیعت کا اتنا بودا تھا کہ ایک بار سور کا ایک بچہ کسی کے گھر
سے دوڑتا ہوا نکلا اور آکر کانسٹیبل سے جو ٹکرایا تو وہ لڑھک

گیا اور آس پاس کھڑے ہوئے گاڑیان ہنس پڑے۔ اس گستاخی پر کانسٹیبل نے ان سب پر ایک ایک کوپک جرمانہ کر دیا اور اس رقم سے اپنے لئے نسوار خرید لی۔ اس بودے کانسٹیبل کی ہمت ہی نہیں پڑی کہ بھوت کو روکتا بلکہ وہ اس کا پیچھا کرتا رہا یہاں تک کہ بھوت اچانک رک گیا اور اس نے سڑ کر پوچھا ”تجھے کیا چاہئے؟“ اور کانسٹیبل کو ایسا مکا دکھایا کہ کسی زندہ آدمی کا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ کانسٹیبل نے کہا ”کچھ نہیں“ اور فوراً وہاں سے سڑ کر واپس چل دیا۔ لیکن یہ بھوت بہت لمبا تھا، اس کی سونچھیں بڑی اور بہت گھنی تھیں۔ وہ ابوخوف پل کی طرف جا رہا تھا اور جلد ہی اندھیرے میں غائب ہو گیا۔